Piya ka Rang

Nadia Jahangeer

ناولٹ

اسے کافی پیتے ہوئے یوں ہی خیال سا آیا کہ اسے یہاں بیٹھے اس کا باپ یا باپ کا جاننے والا لے تو کتنا برا ہوگا اس کے ساتھ۔ اس کا باپ کیا سو گا اور اسی سوچ نے اسے جھٹکے سے وہاں سے اٹھ مجبور کردیا۔ وہ نرمل پہ لعنت کے دو بول بھیج کر ا ہوٹل کے داخلی دروازے کے پاس پہنچی ہی تھی کہ سے فائرنگ کی زور دار آواز سنائی دی۔ اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی اور ایسی ہی چیخ اس کے آگے پیچھ لوگوں نے ماری تھی۔

فائرنگ کی آواز جب بالکل دروازے کے پاس آنے لگی تو ریسٹورنٹ میں موجود ہر فرد نے اپنی بچانے کی خاطر آگے پیچھے دوڑنا شروع کردیا۔ ہر ط تھلبلی مچ گئی۔ اس نے بھی بھاگنا چاہا لیکن اس کی وہیں دم توڑ گئی۔ اسی اثنا میں کوئی بھاگتا ہوا اس سے

نادیہ جہانگیر

پیا کا رنگ

وہ ناسمجھ تھی، بے وقوف تھی، جب ہی نرمل کے اصرار پہ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ نرمل جس کام کے لیے اسے ساتھ لائی ہے وہ کتنا برا اور گھٹیا کام ہے۔ اب جو نرمل کو کونے والی میز پہ اس کے بوائے فرینڈ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف دیکھا تو اسے خود پہ جی بھر کے غصہ آیا کہ وہ کیوں نرمل کی باتوں میں آکر یہاں ریسٹورنٹ میں چلی آئی۔

وہ بے شک سولہ سال کی تھی۔ لیکن نرمل کو یوں بے باکی سے لڑکے سے باتیں کرتے اور اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے دیکھ کر اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ٹکرایا تھا تھا۔ وہ گرنے لگی تھی، جب ٹکرانے وا نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کو باندھ لیا تھا۔ اس بے ساختہ چیخیں بلند ہوگئیں۔

آہنی گرفت والے نے اس کے گرد اپنی گرفت ا مضبوط کرلی۔ چیخیں مارتے مارتے اس کا ماتھا اس شخ کے گلے میں لٹکے تعویذ سے ٹکرایا اور اس کی نظر نے تعویذ دیکھ کر اس کا سرخ و سفید چہرہ دیکھا تو دل ا اچھل کر حلق میں آگیا۔ خان یعنی "خود کش بمبا گرفت والے کا سینہ بھی چوڑا تھا۔ یقیناً" اس۔ بارودی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ ذہن میں آ "نکتے" کو جھٹلا نہ سکی اور اب کی بار جو اس کی چ

بلند ہوئیں، آسمان کو بھی چھو آئیں۔

اتنی بلند ہوتی چیخوں پہ گرفت والے نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھنا چاہا تھا، لیکن وہ سر دائیں بائیں جھٹکنے لگی تھی۔ مجبوراً" بازل خان کو جما کر اس کے منہ پہ ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور اس کے لاکھ چھڑانے کی کوششوں کے باوجود اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کامنی سی لڑکی اس کے بازوؤں میں ہی جھول جائے گی۔ لڑکی کا سانس بند ہو گیا تھا اور ساتھ اس کا بھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ دمہ کی مریضہ ہیں۔ سانس گھٹنے کی وجہ سے ان کی ایسی حالت ہوئی ہے۔ شکر ہے وقت پہ آپ لے آئے، اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" ایمرجنسی وارڈ سے نکلتے ہوئے ڈاکٹر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔

"یہ کب تک ہوش میں آجائیں گی؟" اسے وقت پہ حویلی پہنچنا تھا کہ بابا جان کی کوئی ایک سو ایک کالز آچکی تھیں۔ اب اس لڑکی کو یوں بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جایا جا سکتا تھا۔ یہاں ٹھہرنا اس کی مجبوری تھی اور حویلی پہنچنا بہت ضروری۔ تب ہی ڈاکٹر سے اس نے پوچھا۔

"ایک آدھ گھنٹہ لگ سکتا ہے۔"

"اور تب تک بابا جان کی جان سولی پہ لٹکی رہے گی۔" اس نے سوچا اور گہری سانس لے کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کے ہاتھ میں آئے اور اس نے بنا گنے اور دیکھے وہ سب ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیے۔

"پلیز، اس لڑکی کا خیال رکھنا ہے۔ جب تک یہ ہوش میں نہیں آجاتیں ہم ان کے پاس رہنا ہے اور ان سے ایڈریس وغیرہ لے کر ان کو بہ حفاظت گھر تک پہنچا دیجیے گا۔" اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ڈاکٹر کا چہرہ دیکھا۔ جو اتنے سارے نوٹ دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

"ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔"

"ایسا ہے کہ مجھے جلدی حویلی پہنچنا ہے۔ بابا جان سخت پریشان ہیں، ورنہ میں خود یہاں رکتا۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں سائیں! میں..... میں ان کا مکمل خیال رکھوں گا۔" پیسے پکڑتے ہوئے ڈاکٹر نے بے حد عاجزی کا ثبوت دیا۔ اس نے سر ہلا دیا۔

"میں ایک نظر انہیں دیکھ لوں۔"

"ایسا ہے سائیں، ہم انہیں ذرا وارڈ میں منتقل کر لیں۔ پھر آپ دیکھ لیجئے گا۔ ابھی ذرا مشکل ہے۔" ڈاکٹر کی بات پہ اس نے ذرا سا پیشانی کو رگڑا اور کچھ سوچا۔

"یار، بڑی دیر ہو جائے گی۔ آپ ان کا خیال رکھیے گا۔ مجھے جانا ہے۔" وہ کلائی پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ دوڑاتا پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر نے زور، زور سے سر ہلایا۔ وہ باہر نکلا تو ڈاکٹر نے ہاتھ میں پکڑے پیسوں کو غور سے دیکھا۔

"واہ مولا! تیری کرم نوازیاں..... "ڈاکٹر پیسوں کو چوم کر فوراً" آگے بڑھ گیا تھا کہ کوئی اور نہ دیکھ لے اور دروازے کے پار زمین پہ کروفر سے چلتے بازل خان نے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور مسکرا دیا تھا۔

"حریص لوگ....." اس نے سوچا اور جیپ میں جا بیٹھا۔

☆ ☆ ☆

اسے ہوش آیا تو خود کو نامعلوم جگہ پہ دیکھ کر دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"ایزی..... ایزی....." ڈاکٹر نے اسے اٹھتے دیکھ کر بے ساختہ کہا تو وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"یہ میں کہاں ہوں؟"

"آپ اسپتال میں ہیں، آپ کو خان سائیں یہاں لائے ہیں۔ اگر آپ بہتر محسوس کر رہی ہیں تو پلیز اپنا ایڈریس وغیرہ بتائیں۔ تاکہ آپ کے گھر والوں سے رابطہ کیا جا سکے۔" ڈاکٹر کی بات پہ وہ حیران ہوئی کہ یہ

...سائیں کون ہے بھلا، جو اسے یوں اٹھا کر یہاں ڈال ... اور پھر ریسٹورنٹ والا واقعہ اس کے ذہن میں دوڑ ... اس کے اندر سنسناہٹ پھیل گئی۔

"تو اس شخص نے دھماکا کر دیا ہو گا۔" اس نے ... سے اپنے ہاتھ پیر ہلائے، سب کچھ سلامت تھا۔ ... زندہ تھی۔

"وہ شخص تو مجھ سے لپٹا تھا۔ پھر اس خودکش دھماکے میں، میں کیسے بچ گئی؟" اس کے ذہن میں دور دور تک یہی سوال گونج کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی جانب دیکھا۔

"سنیں... میں زندہ ہوں کیا؟" اس کے بچکانہ سوال پہ ڈاکٹر دھیرے سے مسکرا دیا۔

"کیوں... آپ کو یقین نہیں آرہا؟"

"میں معذور تو نہیں ہوئی؟" اس نے پھر سے ہاتھ پیر ہلا کر اپنے صحیح سلامت ہونے کا یقین کرنا چاہا۔

"بی بی! آپ زندہ ہیں، مکمل ہوش میں ہیں۔ آپ کا کون سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جو آپ معذور ہوتیں صرف دم گھٹا تھا اور اب آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔" ڈاکٹر مجبور تھا کہ اسے مکمل جواب دیتا کہ بازل خان سے ان گنت پیسے جو لے کر جیب میں ڈال رکھے تھے۔ ورنہ اب تو اس کا اپنے ذاتی کلینک میں ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے والا تھا اور وہ یہاں سے فوراً بھاگنا چاہتا تھا، لیکن خان سائیں کے پیسے اور ان کے غصے کا خوف اسے یہیں بیٹھنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

پتا نہیں وہ سمجھی تھی یا نہیں، مگر اس نے سر ہلا دیا۔ حالانکہ وہ بے چین اب بھی تھی کہ جب وہ خودکش بمبار اس کے ساتھ لپٹا تھا تو وہ دھماکے میں زندہ بچ کیسے گئی اور وہ بھی صحیح سلامت، حیرت ہے۔

"پلیز آپ اپنا کوئی کانٹیکٹ نمبر دیں۔ آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" ڈاکٹر کی بات پہ اسے فوراً اپنے بابا کا خیال آیا تھا اور اسے جھرجھری سی آ گئی کہ اگر انہیں اس کا ریسٹورنٹ میں بے وجہ موجود ہونا، پھر دھماکے میں اڑ جانا، پھر بچ کر یوں اسپتال تک پہنچ جانا پتا چلا تو ان کی حالت و کیفیت کیا ہو گی۔

یوں بھی اس کے امتحانات ہو رہے تھے۔ پرسوں آخری پیپر تھا۔ اگر بابا کو اس واقعہ کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ اسے پیپر نہیں دینے دیں گے۔ وہ پہلے ہی اس کی وجہ سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ اب تو اور ہو جائیں گے اور وہ آخری پیپر نہ دے کر بہت کچھ گنوا دیتی، بہتر تھا، بابا کو خبر نہ ہی ہوتی، تب ہی اس نے بنا سوچے سمجھے زرمل کا نمبر ڈاکٹر کو لکھوا دیا جو اگلے پندرہ منٹ میں اس کے پاس تھی۔

"تم زندہ ہو رمل؟" وہ اسے بھی زندہ سلامت دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔

"ہاں... اب تک تو زندہ ہوں، لیکن اگر تم نہ ملتیں تو تمہارے، باپ نے ضرور مجھے اوپر پہنچا دینا تھا۔" رمل اس کی گمشدگی سے پہلے ہی تپی ہوئی تھی، اب تو اس کے سر ہی ہو گئی۔

"تم غائب کہاں ہو گئی تھیں بدتمیز لڑکی... سارے ریسٹورنٹ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے مر چلی تھی میں، حتیٰ کہ ٹیبل، کرسیاں تک کھنگال ڈالے کہ شاید کسی سے چپکی ہوئی ہو۔"

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا منحوس..." جواباً وہ بھی بگڑی۔

"نہ تم مجھے ساتھ لاتیں، نہ وہ دھماکا ہوتا۔" اس کی بات پہ رمل چونکی۔

"دھماکا...؟ کون سا دھماکا..."

"وہ جو ریسٹورنٹ میں ہوا۔"

"وہ دھماکا نہیں فائرنگ ہوئی تھی۔ وہ بھی ہوائی۔ صرف روڈ پہ..."

"لیکن خودکش بمبار تو میرے ساتھ چپکا تھا۔" وہ اسی بات میں الجھی ہوئی تھی۔

"ارے کون سا بمبار..."

"ہیلو لیڈیز... پلیز اب آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔ مجھے بھی کچھ کام ہے۔ مجھے نکلنا ہے۔" ڈاکٹر نے تپ کر درمیان میں مداخلت کی وہ دونوں نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔ اس بے چارے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھیں، جو بوجہ مجبوری وہاں کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کی

بات پہ وہ دونوں تیزی سے سرہلا کر اٹھیں۔

"پلیز خان سائیں پوچھیں تو یہ لازمی بتایئے گا کہ میں آخر تک آپ کے پاس ہی کھڑا رہا تھا۔" ڈاکٹر ماہ نور سے مخاطب تھا۔ رمل نے حیرت سے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"یہ خان سائیں کون ہیں؟" ماہ نور نے جواباً کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کردیا۔ تب ہی رمل کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پہ شہباز محمود کا نمبر دیکھ کر رمل کے ہاتھوں' پیروں سے جان نکل گئی۔

"تمہارے بابا کا ہے۔" وہ رونی سی شکل بنا کر بولی۔

"جلدی سے کوئی بہانہ بناؤ' ورنہ دونوں کا قتل یقینی ہے۔"

"السلام علیکم انکل... انکل سوری... ہم لیٹ ہوگئے۔ ہم دونوں منگلا ڈیم پہ آئے تھے۔ گاڑی خراب ہوگئی۔ نہ... نہ پلیز گاڑی نہ بھیجنا' اب تو گاڑی ٹھیک بھی ہوگئی' بس یہاں میگا مارٹ میں ہیں۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی' ابھی بس پہنچتے ہیں۔ اوکے... بائے۔" اس نے ساری بات ایک ہی سانس میں ختم کی اور فون بند کر کے ایک لمبی گہری سانس لی۔

"یار اگر بابا کو پتا چل گیا تو..." وہ سہم کر بولی۔

"ایک تو تم ڈرپوک بہت ہو۔"

"تو کیا کروں' مجھ سے یہ دوغلا پن نہیں ہوتا۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"تو یہ لو فون' بابا کو بتادو سب۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے..."

"چھوڑ یار' میں نے اتنی بزدل لڑکی ساری زندگی میں نہیں دیکھی۔ لڑکیوں کو بہادر ہونا چاہیے' تاکہ لوگ انہیں شیرنیاں کہیں' شیرنیاں۔"

"یہ شیرنی تم ہی بن سکتی ہو' خوف ناک بندہ دیکھ کے میرا تو دم پہلے ہی گھٹنے لگتا ہے' میں بھلا کیسے بنوں شیرنی۔"

"پتا ہے کیا' تم نے جو خود ساختہ ڈر و خوف اندر گھسا رکھے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اتنا بزدل' ڈرپوک اور گیدڑ بنا رکھا ہے۔ اوہ... سوری گیدڑ نہیں گیدڑی۔"

آخری جملے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تو اس نے زور سے ایک مکا اس کے کندھے پہ جڑ دیا۔

"دفع ہو تم..."

☼ ☼ ☼

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو شہباز محمود نے تیزی سے کچھ پیچھے چھپایا۔

"کیا' کیا شاپنگ کی میرے بیٹے نے؟" تکیے کے نیچے کوئی چیز چھپاتے ہوئے انہوں نے یوں ہی پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

"وہ بابا شاپنگ... شاپنگ تو رمل کو کرنی تھی۔" اس کے بوکھلائے ہوئے انداز پہ شہباز محمود نے چونک کر اسے دیکھا۔

"سب خیریت ہے نا؟" بابا کی زیرک نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ ان کے پاس آن بیٹھی اور ان کے کندھے پہ سر رکھ دیا۔

"بابا..."

"ہوں..."

"پرسوں میرا پیپر ہے۔"

"اور مجھے پتا ہے' مجھے ساری رات جاگنا ہے۔" شہباز محمود نے معصومیت سے کہا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔

"کتنے سیانے ہیں آپ؟" اس کی بات پہ وہ بھی ہنس دیے۔

"تم مجھے یہ بتاؤ اپنی میڈیسن لی؟" باپ کی بات پہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی' تب ہی سر جھکا دیا۔

"کتنی لیزی ہو تم مانو... ایک وقت کی دوا چھوڑنے پہ جانتی ہو تمہاری حالت کیسے ہوجاتی ہے اور تم پھر بھی سستی دکھاتی ہو۔" باپ کی ذرا سی سرزنش نے اسے نادم سا کردیا۔

"اوکے... تم بیٹھو' میں تمہاری دوا لے آؤں اور یہ بتاؤ' چائے پیو گی یا کافی؟" انہوں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جو میرے بابا پئیں۔"

"تو پھر اسٹرونگ سی چائے چلے گی۔"

"بالکل..." اس نے سر ہلایا تو شہباز محمود ملازم کو آواز دیتے باہر نکل گئے۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ اب انہیں کیا بتاتی کہ دوا کے بغیر ہی اس کو اسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ تبھی اس کی نظر تکیے پہ پڑی، جس کے نیچے شہباز محمود نے اسے دیکھتے ہی کچھ چھپایا تھا۔ اس نے یوں ہی غیر ارادی طور پر تکیہ اٹھا دیا۔

نیچے سیاہ رنگ کا پستول پڑا تھا۔ یقیناً" وہ آج پھر اسے نکال کر صاف کر رہے تھے اور اسے دیکھ کر چھپا دیا ۔ وہ ایسی چیزوں سے ڈر جاتی تھی۔ ڈر تو وہ اب بھی گئی تھی اس نے جھٹکے سے تکیہ پستول کے اوپر رکھ دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"میں کہتی ہوں بازل خان، بات مان لے میری، پینتیس برس کا ہو گیا ہے تو، تیری عمر پیچھے نہیں آگے ہی آگے جاری ہے۔ آج نہیں تو کل بڈھا ہو جائے گا۔ کیا یوں ہی بے سہارا رہ کر زندگی گزار پائے گا۔" اپنا من چاہا "موضوع" یاد آگیا تھا اور ان کے سینے کے بائیں جانب شدید درد نے پھر سے سر اٹھایا تھا۔

"دیکھ بازل! میں تیری ماں ہوں، میرے دل میں بھی تیرے لیے ارمان ہیں۔ میں تجھے سہرے میں سجا اور گھوڑی پہ چڑھا دیکھنا چاہتی ہوں، بی جان کی لجاجت سے بھرپور آواز پہ اس کے چہرے پہ تاریک سا سایہ آکر لہرایا اور وہیں ٹھہر گیا۔ آنکھوں میں ایسی سرخی اتری کہ وہیں جم کر رہ گئی۔ اس نے بہت تکلیف دہ سانس اندر کھینچی تھی۔ بی جان نے تاسف سے اسے دیکھا اور اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرنے لگی تھیں۔

"مان لے بات میری، تیرے ہی فائدے کی ہے۔"

"پلیز بی جان... جو بات ناممکن ہے اس کے لیے بحث کرنا بے سود ہے۔" اس کا لہجہ ترشی لیے ہوئے تھا۔ بی جان کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئیں۔

"کیوں بے وقوفانہ ضد میں لگا تا ہے۔ مجھے یہ بتا، تو بیٹا کس آسرے پہ ہے، جس سے تو محبت کرتا تھا، مدتوں ہوئی اس کا تو کفن بھی میلا ہو گیا۔ اب کیا قبر پہ ہی بیٹھ کے ساری رات گزارنی ہے؟" بی جان کی بات پہ وہ تڑپ ہی تو گیا تھا۔

"جو دل میں زندہ ہوتے ہیں۔ وہ کبھی مرتے ہی نہیں بی جان۔ صنوبر میرے دل میں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اس کی قبر ہی میں میری متاع حیات ہے۔"

"ہونہہ... مردوں کو زندہ کہنے والے تیرے جیسے ہی بے عقل ہوتے ہیں۔"

"پلیز بی جان۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ وہ سمجھ گئیں مگر تاسف سے بھرپور سانس لے کر اتنا ضرور کہہ دیا۔

"مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں کرتے بازل خان۔"

"یہاں کوئی زندہ ہو گا تب نا۔" اس نے اندر ہی اندر گرتے آنسوؤں کے ساتھ سوچا تھا۔ درد کی ایک اور تیز لہر جسم میں دوڑی تھی۔

"جا تجھے تیرے بابا سائیں بلا رہے ہیں۔" بی جان نے اس پتھر سے سر پھوڑنے کے بجائے ایک بار پھر چپ ہو جانا ہی بہتر سمجھا اور موضوع بدل دیا۔ وہ سر ہلاتا اٹھ گیا۔

"عادل لالہ کہاں ہیں؟"

"مظفر آباد گیا ہے۔"

"خیریت..."

"کوئی میٹنگ تھی اس کی۔"

"کتنے دن رکیں گے وہاں؟"

"شاید ایک ہفتہ... نوال بھی ساتھ گئی ہے۔ دیکھ لو، بندہ شادی شدہ ہو تو جہاں چاہے بیوی کو لے کر گھومے پھرے۔" بی جان کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے بات گھما پھرا کر پھر سے شادی پہ لے آئی تھیں۔ اس نے سر جھٹک دیا۔ بی جان مایوس ہو گئیں۔

"پتا نہیں میں کب وہ دن دیکھوں گی۔" دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ماں کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ بابا سائیں کے پاس آیا تو انہوں نے ایک چمکتا دمکتا بنڈل اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے بابا سائیں؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"یہ اپنے کشمیر کی چند خوب صورت لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔"

"تو...؟"

"تمہارے لیے منگوائی ہیں۔" انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا۔

"کس لیے؟" اس کے ماتھے پہ ایک ساتھ کئی بل پڑے۔

"تم بچے نہیں ہو بازل خان۔" زیان خان نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہا تو اس سے چپ نہ رہا گیا۔

"یہاں کوئی بھی بچہ نہیں ہے بابا سائیں۔"

"بے شک... گئے وقت کو کوئی واپس نہیں بلا سکتا۔"

"آنے والے وقت کو تو تھاما جا سکتا ہے نا۔"

"تم فضول ضد کرتے ہو۔"

"معذرت بابا سائیں۔ آپ جانتے ہیں صنوبر کے بعد میں کسی کو بھی اپنا نہیں سکتا۔"

"صنوبر تو عرصہ ہوا مر بھی گئی۔"

"مری نہیں، ماری گئی۔" اس نے تصحیح کی۔

"اس کا جرم ہی ایسا تھا۔"

"صرف دوستی نبھانا اتنا بڑا جرم ہے کیا؟"

"صرف دوستی نہیں، ہماری نسل کو داغ لگانے کی بھی اس نے کوشش کی تھی۔"

"بابا! یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں، افشین آپی نے خود محبت کی تھی۔ صنوبر نے انہیں محبت کرنے پہ مجبور نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ افشین اور سفیان کی ملاقاتوں کی عینی گواہ تھی۔"

"نام مت لو اس ذلیل، کتے انسان کا۔" زیان خان کا سفید چہرہ غصے کی شدت سے بھڑک اٹھا تھا۔ ایسی ہی سرخیاں بازل خان کے چہرے پہ پھیلی ہوئی تھیں۔

"ہم نے جو کیا اپنی نسل، اپنا خاندان اور اپنے نسب کو بچانے کے لیے کیا۔"

"آپ افشین اور سفیان کو قتل کروا دیتے، لیکن صنوبر کیوں؟" وہ بے بس ہوا۔ آواز کانپ گئی۔

"افشین نے ہمارے خاندان کا نام ڈبونے کی کوشش کی اور صنوبر نے اس کا ساتھ دیا۔ جتنا جرم افشین کا تھا اتنا ہی جرم صنوبر کا بھی تھا۔"

"میں آج بھی کہتا ہوں بابا سائیں! آپ لوگوں نے افشین اور صنوبر کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"بکواس بند کرو۔ وہ ہمارا حسب نسب ڈبونے پہ لگی تھیں اور ہم ان کے ساتھ بہتری کرتے۔ تم میرے سپوت ہو بازل! زیان خان کے، کیا تمہیں خاندان کی عزت، اپنے باپ، دادا کی عزت عزیز نہیں؟" زیان خان کی چنگھاڑتی آواز پہ وہ کچھ بول نہ سکا۔

بے شک وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے کہ اتنے اعلا خاندان کی بیٹی، ایک گھٹیا خاندان کے لڑکے کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام بنا رہی تھی اور اس کی سہیلی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ ان کا جرم واقعی ناقابل معافی تھا لیکن یہ دل... دل بہت بے ایمان تھا۔ جو اس سہیلی "صنوبر" کے پیار میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس میں کسی اور کی گنجائش تھی نہ جگہ، پھر کیسے وہ بی جان اور بابا سائیں کی بات مان لیتا۔

"بازل خان! بہتر ہے تم شادی کا فیصلہ خود کر لو، ورنہ مجبوراً مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔" زیان خان بے حد سنجیدہ تھے۔

"آئم سوری بابا سائیں۔ آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" اس نے بھی آرام سے کہہ دیا۔

"میں مجبور ہوں۔ مجھے عادل کے برابر تمہیں بھی حصہ دینا ہے، مگر تمہاری شادی کے بعد..."

"اور میں بھی مجبور ہوں، میں نے صنوبر کو قول دیا ہوا ہے۔"

"تمہیں زندہ لوگوں کے بجائے مرے ہوئے لوگوں کو دیے گئے قول زیادہ عزیز ہیں۔"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" زیان خان اسے دیکھ کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

رات آئی بھی اور گزر بھی گئی۔ ساری رات دل بھ

رہا اور آنکھ روتی رہی۔ بیڈ پہ پڑے صنوبر کے تمام خط بولتے رہے، گئے وقت کی باتیں بتاتے رہے اور اسے بے حساب رُلاتے رہے۔ وہ اس کی بچپن کی دوست تھی۔ اس کی ہم راز، ہر چیز میں، ہر کھیل میں اس کی ساتھی۔ بڑی ہوئی تو اس کے ساتھ کی تمنا جاگی۔ لیکن برے وقت نے برا کیا۔ کسی کی سزا اس کا بھی مقدر بن گئی۔ سہیلی کا ساتھ دیتے دیتے اپنی جان گنوا دی اور ساتھ اس کی جان بھی لے گئی۔

✲ ✲ ✲

"وہ نالائق کہاں ہے؟" صبح منشی زمینوں کے کاغذات لے کر اندر آیا تو بابا سائیں کو کھدبد لگ گئی۔

"سو رہا ہے۔" بی جان نے کاغذوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"دن کے گیارہ بج گئے ہیں۔"

"میں نے دو، تین بار باہر بلایا، مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"اس سے کہو منشی آیا ہے۔"

"وہ پھر بھی نہیں آئے گا۔"

"میں اس ضدی لڑکے سے عاجز آچکا ہوں۔" وہ تپے۔ "اس سے کہو کل ہماری زمینوں کا فیصلہ ہے۔ میرے کہے بنا خاموشی سے عدالت چلا جائے۔"

"آج تو اس نے اپنی عدالت لگا رکھی ہوگی۔" بی جان نے گہری سانس لی۔

"عجیب انسان ہے۔ لوگ دس دس عورتیں ایک ساتھ رکھ لیتے ہیں اور یہ ایک ہی عورت کے پیچھے مر رہا ہے۔"

"اور وہ بھی مری ہوئی عورت کے پیچھے۔" بی جان نے تصحیح کی اور منشی سے کاغذات لے کر پڑھنے لگیں۔ ذیان خان نے غصے سے لب بھینچ لیے۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" اس کا بکھرا حلیہ دیکھ کر تخت پہ بیٹھی زمر آپا نے گویا اس کی مشکل کا حل نکالا تھا۔

"آپ سب جانتی ہیں۔" سوجی اور دکھتی آنکھوں کو اس نے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اندر کی جانب دبایا۔

"دیکھ میرے بھائی، گیا وقت ہاتھ نہیں آتا۔ صنوبر کی موت کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی، یہ ہم سب جانتے ہیں....."

"وہ بے قصور تھی۔" زمر آپا کی بات کو اس نے راستے میں ہی روک دیا۔

"یہ تم کہتے ہو، ورنہ اس کا قصور افشین جتنا ہی تھا۔ اس نے افشین کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ اسے بھاگنے کے لیے اپنا برقعہ تک دیا۔ پھر تم کیسے یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ بے قصور تھی؟"

وہ کچھ بول نہ سکا۔

"وہ بے قصور نہیں تھی بازل خان۔ ہمارے جو ریت رواج ہیں، وہاں یہی قصور اصل جرم ہوتا ہے۔ بابا سائیں نے حکم دیا۔ عادل اور شایان نے اس آدمی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ سارے خاندان کو خبر ہو گئی۔ پھر کیسے وہ اپنی قصوروار بیٹی کو چھوڑتے۔ اسے زندہ رہنے دیتے اور جب بیٹی کا بھی گلا کاٹ دیا تو اس کی ساتھی کو زندہ رکھ کر وہ آستین کا سانپ کیسے پالتے۔" زمر آپا کے کھردرے لہجے پہ وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔ (بات سچ تھی، مگر بے ایمان دل تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔) دل اب بھی بے قرار تھا۔ اس مرے ہوئے وجود کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اندر محبت سانس لیتی تھی تو باہر وہ جیتا تھا۔

"لڑکیاں تو سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ دیکھیں سائیں! یہ کتنی خوب صورت ہے۔ میرے بازل کے ساتھ بیٹھی کتنی جچے گی۔" بی جان ذیان سائیں کے پاس ساری تصویریں پھیلائے بیٹھی شوق سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں واقعی....."

"یہ تصویر بازل نے دیکھی؟" انہوں نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

"کیا مطلب؟" بی جان نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "آپ تو کہہ رہے تھے' آج اسے منا کر ہی رہیں گے؟"

"وہ لکیر کا فقیر ہے حاجرہ بیگم۔"

"اس کی طبیعت آپ پہ گئی ہے۔" انہوں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"اس کی محبت کا قتل ہم پہ واجب تھا۔ جب ہم نے اپنی سگی اولاد کو نہیں بخشا تو وہ تو پھر غیر تھی۔" سائیں کا لہجہ دہکتا ہوا تھا۔ سگی اولاد کے لیے بھی ترس کی گنجائش نہ تھی۔

"آہ...." بی جان کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"میری جھلی بیٹی۔" انہوں نے سوچا۔

"حاجرہ بیگم! ہمارے لیے محبتوں سے زیادہ خاندان کی عزت اہمیت رکھتی ہے۔ خاندان پہ حرف آئے ہم میں سے کسی کو قبول نہیں۔" انہوں نے اپنے مخصوص بھاری و کڑک لہجے میں کہا تو حاجرہ بیگم چپ چاپ انہیں دیکھ کر رہ گئیں کہ یہ سخت جان' سخت دل لوگ نہ جانے کیسے پتھر تھے۔ جن کے لیے خاندان کا نام اور مقام سگی اولاد سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ حاجرہ بیگم خود بھی تو اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔ افیشن کی یاد کبھی کبھی انہیں بے چین کرنے آجاتی تھی' لیکن خاندان کی عزت کا خیال انہیں بے سکونی اور بے چینی سے بچالیتا تھا۔ اب بھی جلد ہی وہ اس کیفیت سے نکل آئیں۔

"میں یہ تصویریں خود بازل کو دکھاؤں گی' ایک اور کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ دن برا تھا یا حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ صبح ہی

صبح ڈرائیور کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس نے اسے زحمت دینے کے بجائے گھر کے اندرونی کام کرنے والے ملازم کو اسکول چھوڑنے کو کہا تھا۔ ملازم نے لاکھ کوشش کی' مگر اس سے گاڑی اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ اس کا آج آخری پیپر تھا۔ اسکول پہنچنا ہر صورت لازمی تھا۔

"لگتا ہے چھوٹی بی بی! ڈرائیور کی طرح آج گاڑی کی طبیعت میں بھی گڑبڑ ہے۔" ملازم نے دانت نکوستے ہوئے کہا تو وہ روہانسی سی ہو گئی۔ ملازم نے اسے بیک ویو مرر سے دیکھتے ہوئے "فوراً" پینترا بدلا۔

"آپ ایسا کریں بڑے صاحب جی کو جگا لیں' وہ آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔"

"نہیں نا فیضی! بابا ساری رات میرے ساتھ جاگتے رہے ہیں۔ اب جا کے ان کی آنکھ لگی ہے تو میں کیسے انہیں اٹھا دوں۔" وہ دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹتی بے حد پریشان اور روہانسی ہو رہی تھی۔

"آپ بھی تو چھوٹی بی بی' کمال کرتی ہیں۔ پڑھنا آپ نے ہوتا ہے اور جاگنا بڑے صاحب کو پڑتا ہے۔ ایسا بھی کیا ڈرنا۔ آپ سوتے ہوئے صاحب جی کے پاس بیٹھ کر بھی تو پڑھ سکتی ہیں۔"

"یہ کہنا آسان ہے فیضی۔ تم سب جانتے ہو' اندھیرے سے مجھے کس قدر خوف آتا ہے اور رات تو میرا دم بند کرنے لگتی ہے۔ ایسے میں اگر بابا بھی میرے ساتھ نہ جاگیں تو میں کیسے زندہ رہوں۔"

"چھوڑیں بی بی جی! یہ آپ کا وہم ہے۔ رات باہر ہوتی ہے' اندھیرا باہر ہوتا ہے' آپ اندر۔ دروازے کھڑکیاں بند۔ اور سب سے بڑھ کر بڑے صاحب آپ کے پاس۔ پھر کاہے کا ڈر۔"

وہ جانتی تھی گھر کے ملازم اس سے چوری چھپے اس کے ڈرنے کا مذاق اڑاتے ہیں' لیکن ہمت نہیں کر پاتے کہ اس کے سامنے ہنسیں۔ آج فیضی کے منہ سے نکل گیا تو وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اکیلے میں یا اندھیرے میں اس کی خوف کے مارے جو حالت ہوتی تھی' اس حالت کی وہ خود ہی گواہ تھی یا اس کے بابا۔ اور اس کے بابا کو پوری امید تھی کہ وہ جیسے جیسے بڑی ہو گی۔ اس کا خوف خود بخود جاتا رہے گا' لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بہادر بننے سے پہلے ہی وہ "دمہ" جیسی بیماری کو بھی اپنا لے گی اور یہ بیماری لگتے ہی اس کے باپ نے

پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنا شروع کردیا تھا۔ لیکن بیماری تھی کہ علاج کے باوجود ختم نہیں ہوپارہی تھی۔

اب حالات ایسے تھے کہ امتحانات کے وجہ سے اسے ساری رات جاگ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ ایسے میں کئی بار اس کی حالت خراب ہوئی تھی تو اس کے باپ نے بھی اس کے ساتھ جاگ کر رات گزارنا فرض سمجھ لیا۔

آج اس کا آخری پیپر تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے بابا بہت بے سکون رہے ہیں، لیکن اس نے عہد کرلیا تھا کہ آج کے بعد وہ ان پہ کبھی اپنا خوف ظاہر نہیں کرے گی۔ انہیں سکون دینے کی کوشش کرے گی، یہ ارادہ کرتے ہوئے وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد سکون کسے ملنے والا ہے اور بے سکونی کسے۔۔۔ اور اب صبح ہی صبح پہلی بے سکونی خراب گاڑی کی صورت میں اسے مل ہی چکی تھی۔

"فیضی! میں لیٹ ہورہی ہوں۔ تم ایسا کرو گیٹ بند کرلو۔ میں کسی ٹیکسی یا رکشے سے اسکول چلی جاتی ہوں۔" ہاتھ پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہی وہ تیزی سے گاڑی سے نکلی اور بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گئی کہ اب مزید وقت برباد کرنا سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا۔

"لیکن چھوٹی بی بی! بڑے صاحب۔۔۔" فیضی نے کچھ کہنا چاہا، جواباً اس نے ہاتھ اٹھایا۔

"نہیں کچھ مت بتانا۔ مجھے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ تم گیٹ بند کرلو۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی اور اوپر کمرے میں گیٹ بند ہونے کی آواز سن کر شہباز احمد نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے لگے کیلنڈر پہ سترہ مارچ پہ سرخ پنسل سے گول دائرہ لگا دیکھ کر ایک پل کے لیے ان کے دل کو کچھ ہوا تھا، لیکن اگلے ہی پل انہوں نے ہاتھ مار کر اپنے تکیے کے نیچے سے سیاہ رنگ کا پستول نکال کر اپنی آنکھوں کے سامنے کرلیا تھا۔ پستول دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا تھا۔

اسے نہ تو کوئی ٹیکسی ملی تھی اور نہ ہی کوئی اور سواری، وہ بھاگنے کے انداز سے چلتی بس اسٹاپ کی طرف جارہی تھی۔ اسکول پہنچتے پہنچتے آدھا گھنٹہ تو لازمی لگ جاتا اور اگر وہ پیدل چلتی تو گھنٹے بھر کا سفر تھا۔ ایسے میں اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ رک کر کسی سواری کا انتظار کرے یا یوں ہی پیدل چلتی رہے۔ اس کے کندھے پہ شولڈر بیگ، جبکہ ہاتھ میں کلپ بورڈ اور کتاب تھی۔ بے حد عجلت میں وہ موبائل بھی اٹھانا بھول گئی تھی۔

اب تیز تیز چلتے ہوئے اچانک ہی اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اور بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پیچھے دیکھنے کے بجائے اپنے قدموں کی رفتار اور تیز کرلی تو پیچھے سے چلتے قدموں نے بھی تیزی اختیار کرلی۔ وہ جتنا تیز چل رہی تھی، پچھلے قدم بھی اسی رفتار سے چل رہے تھے۔ اس نے کن اکھیوں سے پیچھے دیکھنا چاہا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے کندھے کے بالکل اوپر کسی مرد کا ہاتھ آچکا تھا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس چیخ کے ساتھ ہی اس کی مزید چیخیں بلند ہوئیں، جب ہاتھ اس کے شولڈر بیگ پہ پڑا تھا اور اس غنڈے نے اس کا بیگ اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

وہ خوف کے مارے وہیں کھڑے ہوکر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر چیخے جارہی تھی۔ تب ہی کسی نے اس کی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اسے چپ ہونے کو کہنا چاہا تھا اور وہ چیخیں مارتی ہوئی اگلے کے کندھے سے جا لگی تھی۔ وہ بندہ وہیں حق دق رہ گیا تھا۔

اسکول کے سفید یونیفارم میں ملبوس کھلے بالوں والی لڑکی کا وہ چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا اس صورت حال سے وہ خود گھبرا گیا تھا کہ وہ لڑکی اس کے کندھے سے لگی ابھی بھی بس چیخے ہی جارہی تھی۔

"ری لیکس۔۔۔ ری لیکس ۔۔ پلیز۔۔۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کو خود سے پرے کرنا چاہا تھا لیکن وہ اور مضبوطی سے اس سے چپک گئی۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ اس کے ماتھے پہ ایک ساتھ کئی لکیریں

ابھریں۔

"پلیز۔۔۔ خود پہ کنٹرول کریں، مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟" دائیں بائیں جو اکا دکا لوگ آجا رہے تھے۔ رک کر دیکھنے لگے۔ بازل خود پہ بمشکل کنٹرول رکھ کر بولا تھا۔

لیکن وہ تھی کہ بس چیخے ہی جارہی تھی۔

"بس کردیں پلیز۔۔۔ اور بند کریں یہ چیخ و پکار۔۔۔ حد ہوتی ہے کوئی۔" بھاری لہجے کی گرج نے ماہ نور کو جھٹکے سے پیچھے ہونے پہ مجبور کیا تھا۔ تب ہی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس نے اسے دیکھا تھا۔ لمبا چوڑا سرخ و سفید رنگت والا وہ مرد اسے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس نے ذہن پہ زور دینا چاہا کہ وہ کون ہے، تب ہی اس کی نظر اس شخص کے گلے میں لٹکتے سیاہ تعویذ پہ پڑی تو وہ چونک پڑی۔

"خود کش۔۔۔۔ بمبار۔۔۔۔" اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ بے ساختہ دو قدم اور پیچھے ہوئی۔ جھٹکے سے آگے دیکھا، پھر پیچھے اور پھر اگلے ہی پل سامنے وہ دوڑ لگائی کہ الاماں۔۔۔۔

بازل خان کا غصے کے مارے چہرہ مزید سرخ ہوگیا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ یہ لڑکی وہ ہی ہے۔ جو ریسٹورنٹ میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس نے نیچے سڑک پہ پڑے چھوٹے سے پتھر کو زور سے ٹھڈا مارا۔ (یہ اس کے غصے کا رد عمل تھا۔) اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا جو اس نے اس لڑکی کو چیخیں مارتے ہوئے دیکھ کر جھٹکے سے روک دی تھی۔ اس نے پیچھے کی جانب بھاگتے ایک شخص کو دیکھا تھا۔ جس کے ہاتھ میں ایک شولڈر بیگ تھا۔ یقیناً" اس نے وہ اسی لڑکی سے چھینا تھا۔ وہ اس شخص کے پیچھے بھاگ کر اس سے وہ بیگ چھین ہی لاتا اگر یہ لڑکی اس کے پوچھنے سے پہلے ہی اس سے ایک بار پھر چمٹ نہ جاتی۔ ایسے میں وہ چور بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور اب یہ لڑکی بھی بھاگ نکلی۔

اسے خود پہ غصہ آیا کہ اس نے اتنے ضروری کام سے جاتے ہوئے یہاں بیچ راستے میں گاڑی کیوں روکی اور خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔

بابا سائیں نے اسے وقت پہ عدالت پہنچنے کو کہا تھا اور اب اتنا وقت نکل گیا تھا۔ آج بابا سائیں کی کچھ زمینوں کا فیصلہ تھا اور بابا سائیں اپنی خراب طبیعت کی وجہ سے عدالت حاضر نہیں ہوسکے تھے اور بڑے بھائی عادل مظفر آباد گئے ہوئے تھے، جن کی واپسی آج ہی متوقع تھی۔ تب ہی ناچار اسے ہی آنا پڑا تھا۔ حالانکہ وہ نہیں آنا چاہ رہا تھا کہ مخالفین کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھے گا اور ایسے میں جو اگر وہ خود پہ کنٹرول نہ رکھ سکا تو پھر۔۔۔ پھر خون بہاتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا ایک دم جی چاہا واپس پلٹ جائے۔ اگلی تاریخ پہ بابا خود حاضر ہوجائیں گے لیکن یہ بھی ناممکن تھا کہ بابا کو دل کا عارضہ لاحق تھا اور وہ ان دنوں نئے نئے اسپتال سے لوٹے تھے اور بیڈ ریسٹ کررہے تھے اور چونکہ فیصلے کی تاریخ تھی۔ سو بہتر تھا وہ عدالت میں حاضر ہو ہی جاتا۔ اس نے دل نہ چاہتے ہوئے بھی جیپ اسٹارٹ کرلی۔

☼ ☼ ☼

عین اسی دن حویلی میں بھونچال اس وقت آیا جب ظہر کی اذانوں کے تھوڑی دیر بعد ہی عادل خان اور شایان خان نماز پڑھنے کی غرض سے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے سیاہ کرولا سے کئی گولیاں آکر انہیں وہیں گرا گئیں۔ عادل تو موقع پر ہی دم توڑ گیا جبکہ شایان نے اسپتال کی راہداری میں پہنچ کر موت سے ہاتھ ملایا تھا۔

حویلی میں خبر پہنچی تو بڑے سائیں زیان علی خان نے وہیں سینہ پکڑلیا۔ دل کا عارضہ پہلے ہی سے لاحق تھا۔ اب کی بار اس کا وار آخری ثابت ہوا اور خالی نہ گیا۔ دل کے دورے نے بڑے سائیں کو بھی ابدی نیند سلا دیا۔ حویلی پہ گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہر طرف کہرام مچ گیا۔

حویلی میں ایسی قیامت بپا تھی کہ کسی کو بھی اس خاندان کے نظر نہ آنے والے آخری مرد کا خیال نہیں

رہا تھا۔ وہ تو جب فون بجا اور کسی نوکر نے اٹھا کے پوچھا۔

"بازل سائیں! آپ تو زندہ ہیں نا؟" نوکر نے جس تجسس سے پوچھا تھا۔ بازل اس کے انداز پہ ٹھٹک سا گیا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔" اس نے جواباً غصے سے پوچھا تھا۔ نوکر فوراً" سیدھا ہوگیا۔ "میرا مطلب ہے چھوٹے سائیں! اس حویلی میں تو قیامت آگئی ہے۔"

"کیا بکواس کررہے ہو؟"

"چھوٹے سائیں! عادل سائیں، شایان سائیں اور بڑے سائیں سب ایک ساتھ چلے گئے۔ سب ختم ہوگئے۔ مرگئے ہیں سب۔"۔۔۔ بازل کے ہاتھ سے فون چھوٹ کر دور جا گرا۔ اسے لگا اس کی بھی بس آخری سانسیں ہیں۔

☼ ☼ ☼

صبح کے حالات کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اسکول پہنچ گئی تھی۔ پیپر تو شروع ہوچکا تھا، لیکن اس کی منت سماجت کام آئی اور اسے بھی بٹھالیا گیا، لیکن باقی کا سارا دن اس کا بے چینی ہی میں گزرا تھا۔ ڈرائیور بعد میں گاڑی ٹھیک کرا کے لے آیا تھا۔ ڈرائیور کو دیکھتے ہی وہ چراغ پا ہوگئی کہ اگر صبح گاڑی ٹھیک ہوتی تو اس کے ساتھ صبح والا واقعہ پیش کیوں آتا۔ ڈرائیور نے اس کی پھٹکار چپ چاپ سن لی تھی۔ وہ گھر پہنچی تو لاؤنج کا شیشے کا دروازہ دھکیلتے ہی اندر سے آتی اگربتیوں کی تیز خوشبو نے اس کی سانسوں کو وہیں روک دیا۔ ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پہ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑگئے۔ سامنے سے آتے فیضی (ملازم) کو اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ فیضی کے چہرے پہ بھی پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔

"آج کوئی خاص بات ہے؟" اس کے لب ذرا سا ہلے تھے۔

"آج چھوٹے صاحب کی برسی ہے۔" ملازم فوراً" بتا کر وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی لاؤنج کے صوفے پہ آبیٹھی۔ فیضی کی بیوی جو کچن میں غریبوں کے لیے کھانا بنانے میں مصروف تھی، اسے دیکھتے ہی باہر نکل آئی۔

"چھوٹی بی بی! پانی لے آؤں؟"

"بابا اپنے کمرے میں ہوں گے؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ دن اس کے باپ کے لیے موت سے کم نہیں ہوتا۔ وہ اس دن سارا وقت اپنے کمرے میں بند رہتے ہیں، باہر نہیں نکلتے، کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ سارا دن روتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔

تب ہی اس نے مرے لہجے میں ملازمہ سے پوچھا تو جواباً" اس نے تیزی سے نفی میں سرہلایا۔

"نہیں جی! بڑے صاحب تو صبح سے گھر سے نکلے ہوئے ہیں۔"

"لیکن آج تو۔۔۔"

"شاید وہ چھوٹے صاحب کی قبر پہ گئے ہوں۔" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اسے وہ دن شدت سے یاد آیا، جب پانچ سال پہلے شہباز محمود اپنے بیٹے کے مجبور کرنے پہ اس کی کلاس فیلو افشین کا رشتہ لے کر ذیان خان کے گھر گئے تھے۔ وہ بھی بابا کے ساتھ تھی۔ وہاں ذیان خان نے انہیں نچلی ذات کا طعنہ دے کر دھتکار کر گھر سے نکالا تھا اور پھر جب اس کے بھائی سفیان کو باپ کی اتنی تذلیل کا پتا چلا

تواس نے جذباتی قدم اٹھایا۔ اور عین اس وقت جب وہ لڑکی لے کر بھاگ رہا تھا ان لوگوں نے اسے پکڑ لیا تھا اور پھر ٹوکے سے اس کے ہزاروں ٹکڑے کر کے شہباز محمود کے گھر پہنچائے تھے۔ اپنے بیٹے کی ناقابل شناخت لاش دیکھ کر شہباز محمود بلبلا اٹھے تھے لیکن ان لوگوں کی طاقت کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ شہباز محمود اکیلے تھے اور وہ پورا خاندان۔ یہ پانچ سال شہباز محمود نے کس قدر اذیت اور تکلیف میں گزارے تھے۔ یہ بات صرف وہی جانتی تھی۔ ہر سال جب یہ دن آتا شہباز خون کے آنسو روتے۔ اپنی بے بسی پہ تڑپتے اور وہ باپ کو تڑپتا دیکھ کر خود تڑپ جاتی۔

"چھوٹی بی بی... چھوٹی بی بی... یہ پانی پئیں پلیز۔" اسے اچانک سے ملازمہ نے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو وہ چونک پڑی۔

"آپ کا سانس پھولنے لگا ہے۔ آپ ان ہیلر لے لیں۔" اور اسے ملازمہ کے بتانے پہ احساس ہوا کہ اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے، جبکہ سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیے تو ملازمہ نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کی کوئی بھی دوا وہاں نہیں تھی۔ تب ہی وہ اندر کی طرف بھاگی اور دوڑتے ہوئے لا کر ان ہیلر اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ ذرا سا پرسکون ہوئی تو ملازم نے اس کا بجتا ہوا سیل فون لا کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ملازم کو دیکھا۔

"بڑے صاحب ہیں۔" اس نے فون پکڑ کر کان سے لگایا تو ملازم، ملازمہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔

"بابا۔" ابھی اس نے باپ کو پکارا ہی تھا کہ دوسری طرف سے شہباز محمود کا جان دار قہقہہ برآمد ہوا۔ وہ حیران ہوئی کہ آج تو بھائی کی برسی تھی۔ آج کا دن تو شہباز محمود کے لیے ماتم کا دن تھا۔ وہ تو یہ سارا دن روتے ہوئے گزارتے تھے پھر آج اور ابھی، یہ اس نے کیا سنا تھا۔ وہ ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، کیوں؟ اور اس کا جواب اسے اگلے چند ثانیوں میں ہی مل گیا۔

"مانو، میری پیاری مانو، تمہیں مبارک ہو، مبارک ہو بیٹا۔"

"بابا... آپ خیریت سے ہیں۔" معصوم دل باپ کا جوش سے بھرا لہجہ سن کر بجائے خوش ہونے کے سکڑنے لگا اور ایک شبہ سا بھی گزرا کہ شاید اس کے باپ کا دماغ چل گیا ہے۔

"آج ہی تو خیریت ہوئی ہے۔ میں آج ہی تو ٹھیک ہوا ہوں۔" باپ کی بات پہ وہ الجھی ہی تھی کہ اس کے باپ نے اگلے ہی لمحے اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی۔

"تم خوشیاں مناؤ مانو، آج تمہارے بھائی کا بدلہ میں نے چکا دیا۔ آج میرے بیٹے کے قاتل بھی اوپر چلے گئے۔" باپ نے پھر سے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"بابا! آپ نے... آپ..." مارے غم، دکھ کے اس سے بات بھی مکمل نہ ہو پائی اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

"ہاں... ہاں... میں نے... شہباز احمد نے، آج اپنے بیٹے کا حساب برابر کر دیا۔ اس کے قاتلوں کو قتل کر دیا۔" باپ کے کھنکتے لہجے پہ ماہ نور کے اندر خوف کی ایک... تیز سی لہر دوڑی تھی اور اس کا لہجہ بھی کانپ سا گیا۔

"نہیں، بابا! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ ظالم ہیں۔ سفاک ہیں۔ آپ کے پیچھے پڑ جائیں گے بابا۔"

"شہباز احمد کسی سے نہیں ڈرتا اور ڈرے بھی کیوں، اس کے پاس کون سا جوان بیٹا ہے جسے وہ مارنے آئیں گے، جس کے قتل کی وہ دھمکیاں دیں گے۔"

اب کی بار شہباز احمد کا لہجہ ذرا سا لڑکھڑایا تھا یا شاید رندھا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل شہباز احمد نے اس پہ فوراً" قابو پایا تھا۔

"میرا جوان بیٹا تو آج وہاں اوپر بیٹھا خوش ہو رہا ہوگا۔ مجھے داد دے رہا ہوگا۔ مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا، یہ میں نے لمحوں میں کیا سے کیا کر دیا۔ میں نے کیسے

ان لوگوں کو ڈھیر کردیا۔" ان کے ایک ایک لفظ سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"بابا پلیز! آپ گھر آئیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ خوف سے کانپ کر رہ گئی۔ ہراساں نظروں سے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ جواباً" شہباز احمد نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"میں گھر ہی آرہا ہوں مانو۔ تم ملازموں سے کہو' وہ ڈھول تاشوں کا انتظام کریں۔ آج میری حویلی میں سفیان کا ماتم نہیں بلکہ اس کے قاتلوں کی موت کا جشن منایا جائے گا۔ آج ان ظالموں نے موت کا منہ دیکھا ہے' میں ان کی موت پہ خود ناچوں گا۔" شہباز احمد یقیناً" خوشی سے پاگل ہوئے جارہے تھے۔ جب ہی تو خوف و ہراس میں گھری ماہ نور نے انہیں ہوش میں آنے کو کہنا چاہا تھا۔ لیکن چاہنے کے باوجود اس کے گلے سے آواز نہیں نکل سکی تھی اور اس کی آواز نکلنے سے پہلے دوسری طرف سے آتی آواز نے اس کے کان وہیں سن کردیے۔

خوشی سے جھومتے اور پاگل ہوتے شہباز محمود یہ بھول گئے تھے کہ وہ اس وقت گاڑی میں بیٹھے ہیں اور گاڑی بھی خود ڈرائیو کررہے ہیں۔ اپنے حال میں مست وہ آگے سے آتی بڑی گاڑی کو دیکھ نہ پائے اور اک چیخ نے ان کو بھی اپنے بیٹے کے پاس بھیج دیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن عدالتی فیصلہ تو نہ ہوسکا' البتہ آسمانی فیصلہ ہوگیا۔ بازل خان افتاں' خیزاں حویلی پہنچا تھا اور گھر میں رکھے تین جنازے دیکھ کر جیسے پتھر سا ہوگیا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا باپ کو دیکھے' بھائی کو یا پھر بہنوئی کو اور روئے تو پھر کس کو....

وہ مرد تھا اور مرد کی آنکھ میں آنسو آجائے' یہ اس کی مردانگی کے خلاف ہے' لیکن جہاں بات خون کے رشتوں کے بچھڑنے کی ہو وہاں مردانگی کو سنبھال کر رکھنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ تین لاشیں دیکھ کر اس کے اندر___ خون کے آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ دھاڑیں مار کر رو دیتا جو اگر مضبوط حواس کا نہ ہوتا۔ اس کی ماں نے اسے دیکھا تو تڑپ کر اس کے چوڑے سینے سے آ لگیں اور ماں کے ساتھ لگتے ہی اس کا بھی بہانا چل گیا۔ اس کی آنکھیں بہہ نکلیں۔ بیوہ ہوئی بہن نے سامنے کھڑے بھائی کو دیکھا تو وہ بھی بھائی سے لپٹ گئی اور بھابھی کو تو ہوش ہی نہیں تھا' وہ عادل کی لاش کے پاس ہی بے ہوش پڑی تھیں۔ عورتیں ان پہ پانی چھڑک چھڑک کر ہوش میں لانے کی کوشش کررہی تھیں۔

جنازے کے وقت بہت سے لوگوں سے اس نے مسجد والا واقعہ سنا تھا اور کسی عینی شاہد نے بتایا تھا کہ گاڑی سے فائرنگ کرنے والا ___ ادھیڑ عمر کا مرد تھا اور اس مرد کا ناک نقشہ سن کر اسے یہ جاننے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کون تھا۔

"یہ کام شہباز احمد کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔" رات بی جان نے کہا تو اس کا یقین کامل ہوگیا۔

"تم اب کیا کروگے بازل؟" ماں نے اسے امید سے دیکھا تھا۔ وہ جھک گیا۔

"حکم بی جی۔"

"خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تمہیں یہ بدلہ چکانا ہے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" اس نے اک عزم سے مضبوط لہجے میں کہا اور کھڑکی کے پار کھڑی قسمت نے سکون سے سوچا تھا کہ خون کا بدلہ تو آج مکمل ہوا تھا اور یہ ظالم لوگ کیا عزم کررہے تھے اور اب قسمت میں کیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے باپ کی لاش دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ روئے تو کیسے۔ چیخیں مارے' سسکے یا بین کرے؟ بھائی کے بعد اب باپ کو بھی خود سے بچھڑتا دیکھ کر وہ اندر سے ڈھے سی گئی تھی۔ بس یونہی مردہ نگاہوں سے باپ کا چہرہ دیکھتی اور اپنے ہاتھوں سے چھوتی رہی۔ اس کے آنسو بہتے رہے۔ پیدا ہوتے ہی اس نے ماں کو

کھو دیا تھا اور بڑی ہوئی تو بھائی چلا گیا اور اب باپ نے بھی اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ جتنا روتی کم تھا اور اب اسے ساری زندگی ہی رونا تھا کہ وہ مسکین، یتیم اور بے آسرا ہو گئی تھی۔ باپ کے جنازے کے وقت وہ رو، رو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور جب ہوش آیا تو غش پہ غش کھانے لگی تھی۔ گھر پہ صرف ملازم تھے۔ رشتہ دار کوئی تھا نہیں۔ جو اسے سنبھالتا۔ سب ملازم اس کی حالت دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ اسے نہ کچھ ہو جائے۔ کسی نے ڈاکٹر بلایا تھا اور سکون آور انجکشن لگتے ہی وہ بے سدھ ہو گئی تھی۔

اور جب ہوش آیا تھا تو خالی گھر دیکھ کر وہ اندر سے خالی ہو گئی تھی۔ جس ملازم کے جو چیز ہاتھ لگی تھی، وہ لے کر بھاگ گیا تھا۔ گھر میں، نہ گاڑیاں تھیں اور نہ زیور اور قیمتی اشیا، گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ لاؤنج میں شہباز محمود کی تصویر دیکھ کر وہ پھر سے ڈھے گئی تھی۔ روتے روتے وہ پھر سے بے ہوش ہو جاتی جو اگر اس کے کان کے پاس کوئی عجیب سی چیز نہ آن ٹھہرتی۔ اس نے روتے روتے یونہی سر اٹھا کر دیکھا تھا اور اپنے سر پہ موت کا فرشتہ دیکھ کر اس کی سانسیں رک گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے اس کی کنپٹی پہ رکھ دیا تھا۔

"شہزاد محمود کہاں ہے؟" کڑک ۔ لہجہ گرجتا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ سامنے وہی "خود کش بمبار" کھڑا تھا۔ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔

"یہیں کھڑی رہو۔ اب ایک قدم بھی پیچھے ہوئیں تو تمام کی تمام گولیاں تم پہ انڈیل دوں گا۔" بھاری لہجے میں جو دھمکی تھی، وہ اس کی روح نکالنے کے لیے کافی تھی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی تھی۔ بازل نے بھنویں اچکا کر اس سے پھر پوچھا تھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں، شہباز محمود کہاں ہیں۔" وہ تھر تھر کانپتی ہراساں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کچھ بولتی ہے یا...؟" بازل نے بے حد مشتعل ہو کر ٹریگر پر زور سے انگلی ماری تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"وہ... وہ نہیں...." وہ ساتھ نفی میں بھی گردن ہلانے لگی۔

"اگر وہ اس وقت گھر پہ نہیں تو پھر کہاں ہے وہ؟" اب بھی اس کا لہجہ وہی سختی لیے ہوئے تھا۔ اس کے آنسو نکل آئے اور ساتھ وہ مسلسل نفی میں سر ہلاتی گئی۔

"میں کہہ رہا ہوں، بتاؤ وہ کہاں ہے؟" اس نے بے حد غصے سے اسے بالوں سے پکڑنا چاہا تھا۔ ایسے میں جھٹکے سے وہ اس کے قریب ہوا تھا کہ وہ روتے ہوئے اس کے سینے سے آن لگی۔ اس کی سانسیں وہیں تھم گئیں۔ وہ حق دق سا اس کے بال تک پکڑنا بھول گیا۔ دل تھا کہ دھڑکنا بھول گیا۔

"وہ مر گئے ہیں۔ میرے بابا مر گئے۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے، میں بے آسرا ہو گئی۔ ان کی مانو بے آسرا ہو گئی۔ یتیم ہو گئی ان کی مانو۔" وہ روتے روتے چلّانے لگی تھی اور چلّاتے چلّاتے ہوش کھونے لگی تھی۔ وہ دم سادھے اسے سن رہا تھا۔ اپنے دل کے ساتھ لگے کسی اور کے دل کی آواز سن رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

بازل کی گاڑی ایک جھٹکے سے پورچ میں آن رکی تھی۔ بڑے ہال سے اندر داخل ہوتی نوال بھابھی کے قدموں میں بھی بجلی سی بھر گئی۔ وہ دونوں بجلی کی سی رفتار سے باہر نکلی تھیں۔

"مجھے یقین ہے، میرا بیٹا خالی ہاتھ نہیں لوٹا ہو گا۔ اپنے پیاروں کا حساب برابر کر دیا ہو گا۔" بی جان کے لہجے میں تفاخر تھا۔ غرور تھا۔ بازل نے ڈرائیونگ سیٹ سے اترتے ہی ماہ نور کو بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچا تھا۔ ماہ نور کی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ اسے بالوں سے کھینچتا ہوا بی جان اور نوال بھابھی کی طرف لایا تھا۔

"بازل! یہ... یہ کیا؟ تم تو شہباز محمود کو ختم کرنے گئے تھے۔" بی جان نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اس نے بالوں سے پکڑی ہوئی ماہ نور کو بی جان کے قدموں میں

ڈال دیا تھا۔

"یہ شہباز محمود کی بیٹی ہے۔"

"اور شہباز محمود...؟"

"وہ کتا مجھ سے پہلے ہی مر گیا۔" ماہ نور نے گرتے گرتے خود کو سنبھالا اور جھٹکے سے اٹھ کر اس پہ جھپٹی اور اسے کالر سے پکڑ لیا۔

"یہ تم نے کتا کس کو کہا۔ تم ہو گے کتے۔ تمہارا خاندان..." بازل کے بھاری ہاتھ نے اسے گالی پوری کرنے نہیں دی تھی۔ اس کے نرم گال پہ پانچ انگلیوں نے اپنے مضبوط نشانات ثبت کر دیے۔ تب ہی ماہ نور کو پیچھے بالوں سے کسی نے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا تھا۔

"تو یہ ہے میرے شایان کے قاتل کی بیٹی۔" زمر آپا نے چلا کر اس کے چہرے پہ تھپڑ مارا تھا۔

"اور میرے بھائی عادل کے قاتل کی بیٹی، یہی ہے نا" اسے ایک اور تھپڑ لگا تھا۔ "میرے باپ کی موت کی وجہ بننے والے خونی کی یہ بیٹی ہے نا۔" اور یکے بعد دیگرے کئی تھپڑ اس کے چہرے پہ پڑے تھے۔ اس کا چہرہ سُن ہو گیا اور جب اس کی پشت پہ نوال بھابھی کے گھونسے پڑے تو وہ بازل کے پیروں میں جا گری تھی۔ اس کے منہ سے خون کی دھار نکلی ___ تھی۔ زمر آپا اور نوال بھابھی نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ بازل نے نخوت سے اپنے قدم اندر کی جانب بڑھا دیے۔ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔

اس کی ___ آنکھ کھلی تو اپنے چہار سو گھپ اندھیرا دیکھ کر دل اچھل کر حلق میں آ گیا، بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا، لیکن دکھتے جسم نے ایسا کرنے نہ دیا، وہ اپنی جگہ کراہ کر رہ گئی۔ اسے آس پاس عجیب طرح کی آوازیں سنائی دیں شاید پاس ہی جانور بندھے تھے۔

"یا رب۔" اندھیرے میں وہ بلبلائی تھی۔

اس نے وہ کالی رات یوں ہی روتے گزاری تھی۔ صبح ہونے کا احساس تب ہوا جب کمرے کے واحد روشن دان سے روشنی نے اندر جھانکا تھا۔ تب اس نے سوجی ہوئی آنکھوں سے اپنے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ اس سے ذرا پرے گائے بھینسیں بندھی تھیں۔

اسے ابکائی سی آ گئی۔ وہ وہیں دوہری ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اس لڑکی کا کیا کرنا ہے؟" بی جان نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"پڑا رہنے دیں اسے یہیں کہیں۔"

"تم اسے مار کر وہیں پھینک آتے۔"

"ایک بار موت آ جائے تو فائدہ کوئی نہیں، بندہ بار بار مرے تو اسے زندگی سمجھ میں آتی ہے۔" پیچھے سے آتی زمر آپا نے کہا تو اس کے دل کو ہلکا سا کسی نے دبایا۔

"یہ لڑکی ہمارے مردوں کے قاتل کی بیٹی ہے۔ اسے تو ہم آسانی سے مرنے بھی نہ دیں گے۔" زمر آپا کے لہجے میں ایک جنون سا تھا۔ وہ محسوس کر کے سر ہلانے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، اسے نوکرانی بنا لیں، گھر کے سارے کام کرے گی۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کچھ کر پائے گی، بمشکل پندرہ سولہ سال کی ہے۔" بی جان نے اس کا حدود اربعہ بیان کیا تھا۔

"میرے ہتھے چڑھی تو سب کام کرے گی۔ چار ٹھڈے مار کر میں اسے اس کی اوقات یاد کرا دوں گی۔" زمر آپا کا لہجہ حتمی تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم ناشتہ کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

فاتحہ خوانی کے لیے کچھ لوگ آئے تھے۔ وہ تیار ہو کر آیا تو نوال بھابھی اس لڑکی کو بالوں سے پکڑ کے گھسیٹتی ہوئی باہر لا رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر ادھر دیکھ کر نظریں دوسری جانب کر لیں لیکن جب مردان خانے میں بیٹھا تھا۔ فاتحہ کے لیے آئے لوگوں کے لیے کھانا لگایا جا رہا تھا، تب ایک ملازم نے اس کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔ وہ اسی پل اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"خیریت بازل خان؟" ایک شخص نے اس کے بے ساختہ انداز پہ پوچھا تو وہ زبردستی ہلکا سا مسکرایا اور سر ہلا دیا۔

"آپ لوگ کھانا کھائیں ہمیں ذرا بی جان کی بات سن لوں۔" وہ باہر نکلا تو ایک طرف ملازموں کا جمگھٹا لگا دیکھا' وہ تیزی سے اس جانب آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ملازم ہٹنے لگے۔

"دیکھو' یہ بے غیرت شاید مرگئی ہے۔" تو اول بھابھی نے پیر کی نوک سے بے ہوش پڑی ماہ نور کے چہرے کو پرے کیا تھا۔ وہ ماتھے پر ڈھیروں لکیریں لیے اس بے جان وجود کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک طرف پڑے اس کے ہاتھ کی نبض چیک کی' کچھ سمجھ میں نہ آیا تو جھک کر اس کے دل کے پاس کان لگا دیا۔

"فخر الدین! میری گاڑی کی چابی لاؤ۔" اس نے تیزی سے کہا اور بھابھی کی طرف دیکھا۔

"اسے اٹھوا کر گاڑی میں ڈالیں۔ یہ ابھی زندہ ہے۔"

"رہنے دو اسے یوں ہی مرنے دو۔"

"کیوں خوامخواہ کا قتل سر لے رہی ہیں ہمیں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں' آپ اسے گاڑی میں ڈلوائیں۔" بھابھی سے بات کرتے ہوئے اس نے تیزی سے چابی فخرالدین سے لی اور اسی تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

"وقت پہ میڈیسنز نہیں لی گئیں' دم گھٹنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔" ڈاکٹر کے بتانے پہ اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

"یہ دمہ کی مریضہ ہیں۔ ڈسٹ الرجک بھی ہیں۔ پلیز صاف ستھرا ماحول انہیں مہیا کریں اور سب سے بڑھ کر دوا وقت پہ دی جائے ورنہ ان کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر نے پروفیشنل انداز سے کہا تو وہ صرف سر ہی ہلا پایا۔

"اب تو وہ مکمل ہوش میں ہیں' آپ ان کے پاس جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" نسخہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تو وہ گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔ وہ جب اس کے کمرے میں آیا تو وہ یوں ہی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ ایک نظر اس پہ ڈال کر وہ کمرے کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ باہر دنیا اپنے اپنے کاموں میں مصروف اور اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھتا رہا۔ پھر اکتا کر واپس مڑا ہی تھا جب اس کی نظر ایک بار اس پر پڑی' اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔

اس نے کسی ڈاکٹر کو بلانے کے بجائے بے ساختہ جھک کر اس کی بات سننا چاہی' ماہ نور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ نرم' ملائم ہاتھ میں آہنی ہاتھ کانپ کر رہ گیا۔

"مجھے میرے بابا کے پاس لے چلو۔" نیم وا آنکھوں سے اس نے التجا کی تھی۔ "پلیز مجھے میرے بابا کے پاس چھوڑ آؤ۔"

وہ اس کی التجا پہ گہری سانس لے کر ہاتھ چھڑا گیا۔

"فکر نہ کرو تم بہت جلد اپنے بابا کے پاس ہو گی۔"

"تم آج ہی مجھے مار دو۔" اس نے زارو قطار روتے ہوئے التجا کی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر نظریں پھیر گیا۔

"ابھی تو تم حویلی چلنے کی تیاری کرو۔"

"مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"تم سے تمہاری مرضی کس نے پوچھی ہے؟ چلو اٹھو۔" اس نے سختی سے کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی۔

بازل خان حیران ہوا کہ اس نے اتنی آسانی سے اس کی بات مان کیسے لی لیکن اس کی یہ حیرت اس وقت دور ہو گئی جب ماہ نور نے گاڑی کو فل اسپیڈ میں دیکھا تو تیزی سے اپنی جانب کا دروازہ کھول کر باہر کودنے کی کوشش کی لیکن بازل نے سرعت سے اسے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے؟" اس نے دھاڑ کر پوچھا اور گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گاڑی چرچراتی ہوئی تھوڑی دور جا کر رک گئی۔

"پلیز مجھے مرنے دو میں مرنا چاہتی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بازل کی کلائی پہ گرفت مضبوط تھی۔

”یہ تمہاری بھول ہے کہ تم آرام سے مرجاؤ گی۔“ اس نے گھر کا۔

”جانتی ہو‘ تمہارے باپ نے میرے بھائی اور بہنوئی کو قتل کیا ہے۔ اور اپنے بھائی بہنوئی کے قاتل کی بیٹی کو میں آسانی سے کیسے چھوڑ دوں۔“

”تمہارے بھائی اور بہنوئی کا قاتل مر چکا ہے۔ مجھ سے تمہیں کیا لینا ہے۔“ جواباً“ وہ بھی چلائی۔

”کاش تمہارا باپ زندہ ہوتا تو میں بتاتا کہ مجھے تم سے کیا مل سکتا ہے۔“

”تم لوگ بہت ظالم ہو۔“

”ابھی تم نے ظلم دیکھا ہی کب ہے‘ ابھی تو شروعات ہے۔ چلو آرام سے سیدھی ہو کے بیٹھو ورنہ بالوں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔“ اس نے جھٹکے سے اسے دروازے کی طرف پٹخا اور خود گاڑی اسٹارٹ کرلی۔ اس کا سر کھڑکی سے ٹکرایا تو چکرا کر رہ گیا۔ آنکھوں میں آئے آنسو رواں ہو گئے۔ بازل لب بھینچے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

☼ ☼ ☼

”یہ بچ گئی؟“ نوال بھابھی نے اسے دیکھتے ہی نفرت سے کہا تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”ہاں‘ ابھی اس کے مرنے کا دن نہیں آیا۔“

”یہ مرے گی تو ہمارے ہی ہاتھ سے۔“ نوال نے آگے بڑھ کر اسے پکڑنا چاہا تو بازل نے ہاتھ اٹھا دیا۔

”ابھی رہنے دیں۔“ وہ جو خوف سے سمٹ گئی تھی۔ بازل کے روکنے پہ بھی سیدھی نہ ہو سکی۔

”اے نوال! اسے میرے پاس لے آ۔ ذرا میری ٹانگیں تو دبائے۔“ زمر نے تخت پہ بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تو وہ ڈر کے مارے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”مجھے نہیں ان کے پاس جانا۔“ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

”جائے گی تو تیری ماں بھی۔ چل دفع ہو‘ آگے لگ۔“ نوال نے پیچھے سے اسے دھکا دیا تو وہ سیدھی زمر کے تخت کے پاس آگری۔

”ہوں‘ تو تیرا مکر بھی تیرے کسی کام نہ آیا۔ تو پھر اسی دہلیز پہ آن پڑی نا۔“ لمبا سا ہنکارا بھر کر زمر آپا نے کہا تو وہ سہم کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”یہ بھول جا لڑکی کہ اب تو یہاں سے نکل پائے گی۔ موت کا فرشتہ بھی آئے نا تو ہماری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر پائے گا۔ چل نیچے بیٹھ اور میری ٹانگیں دبا۔“ زمر آپا نے ٹانگیں نیچے لٹکائیں تو وہ چپ چاپ کھڑی رہی کہ کیا کرے۔ اسے ایسے کام کرنا کہاں آتے تھے بھلا۔

”دفع ہو‘ بیٹھ نیچے۔“ زمر آپا نے اپنا بھاری پیر اس کے پیٹ میں دے مارا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔ مردانے کی طرف بڑھتے بازل نے ذرا سا مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”ایک تو یہ لڑکی چیخیں بہت مارتی ہے۔“ اس نے ناگواری سے سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بازل کو بی جان کے کمرے سے نکلتی دکھائی دی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئلوں والی انگیٹھی تھی۔ ساتھ وہ کھانس بھی رہی تھی۔ بازل اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”یہ انگیٹھی نیچے رکھ دو۔“

”اگر اس میں نئے کوئلے نہ ڈالے تو بی جان ان کوئلوں کو مجھ پہ انڈیل دیں گی۔“ وہ سہمے ہوئے انداز سے بولی تھی ساتھ‘ کھانسی بھی تھی۔

”تم رکھ دو نیچے اور اپنا سانس درست کرو۔“ اس کے کہنے پہ اس نے انگیٹھی نیچے رکھ دی تھی اور سانس کو درست کیسے کرتی‘ سانس بگڑ رہا تھا۔ کھانسی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ بازل غور سے اسے دیکھا۔

”میری گاڑی میں تمہاری میڈیسنز ہیں۔ تم یہیں رکو‘ میں لاتا ہوں۔“ اسے وہیں کھانستا چھوڑ کر وہ تیزی سے گاڑی کی جانب بڑھا۔ تب تک وہ کھانستے کھانستے برآمدے کے ستون کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ بازل تیزی سے دوائیں لے کر مڑا تھا لیکن اتنے میں اس کی

حالت غیر ہو چکی تھی۔ کھانستے ہوئے وہ ہوش حواس سے بھی بے گانہ لگ رہی تھی۔ بازل نے ان ہیلر نکال کے اس کے منہ سے لگانا چاہا تھا۔ اسی لمحے کھانسی سے تڑپتی ہوئی ماہ نور کا ہاتھ کوئلوں والی انگیٹھی میں جا پڑا تھا۔ بازل نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبالیا تھا۔ جلے ہوئے ہاتھ کی تپش اس کے اندر تک اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم لوگ مجھے ایک ہی بار کیوں نہیں مار دیتے؟" وہ صبح صحن میں جھاڑو دے رہی تھی، جب جلے ہوئے ہاتھ سے جھاڑو پکڑنا مشکل ہو گیا تو اس نے غصے سے جھاڑو دور پھینک دی۔ برآمدے سے گزرتی زمر آپا نے اسے دیکھا تو آ کر اسے الجھے بکھرے بالوں سے پکڑ لیا۔ تب وہ بے بسی سے چلائی تھی۔ اور جواباً" زمر آپا نے اس کے منہ پہ کس کر تھپڑ دے مارا تھا۔

"تم پل پل مرو گی تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ تمہارے باپ نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے ہمارے ساتھ۔"

"میرے بابا مر چکے ہیں۔" وہ رو پڑی۔

"تم تو زندہ ہو نا، اپنے بابا کی لاڈلی بیٹی۔ تمہیں پل پل مار کر ہمیں اتنی تو تسکین ملے گی نا کہ ہم نے اپنے پیاروں کا بدلہ لینے کی کوشش تو کی۔" زمر آپا نے جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑے تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے بازل نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

"چلو اٹھاؤ یہ جھاڑو، اور پانچ منٹ میں سارا کام ختم کرو۔" زمر آپا نے جھاڑو کی طرف اشارہ کیا تو اس نے روتے ہوئے وہ جھاڑو اٹھالی۔ جھاڑو پکڑتے ہوئے اس کی ایک اور چیخ نکلی تھی کہ ہاتھ میں چھالا بن چکا تھا اور شدید درد اٹھا زمر آپا نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"زیادہ نازک اندام بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم ملازمہ بن چکی ہو اس گھر کی۔ ساری عمر نوکرانی بن کے گزارنی ہے۔ بہتر ہے اپنے اطوار بدل لو۔" مجبوراً" وہ جھاڑو پکڑ کر نیچے پھیرنے لگی تھی، شدید درد کی لہریں پورے جسم میں دوڑی تھیں۔ زمر آپا وہاں سے ہٹ گئیں تو ایک ملازم نے لا کر مرہم اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ چھوٹے سائیں نے بھیجا ہے۔ اسے جلے ہوئے ہاتھ پہ لگالو۔" اس نے وہ کریم پکڑی اور پھر بے حد غصے سے پیچھے کھلی کھڑکی کی طرف پھینک دی کھڑکی سے ذرا پرے کھڑے بازل نے گہری سانس لے کر اندر گرنے والی وہ ـــــ ٹیوب اٹھالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آج تم نے پچھواڑے والے کمرے میں سونا ہے۔" گھر کا ایک ملازم اس کے سر پہ کھڑا ہوا تھا۔

"مجھے کہیں نہیں سونا۔ میں یہیں برآمدے میں لائٹ کے نیچے بیٹھی رہوں گی۔" وہ انرجی سیور کی روشنی میں اپنا جلا ہوا ہاتھ پھیلا کر دیکھ رہی تھی۔

"ارے شکر کر بی بی، تجھے سونے کے لیے کمرہ مل رہا ہے، ورنہ ہم ہیں، ساری رات چوکیداری کرتے دروازے کے پاس اونگھتے رہتے ہیں۔"

"بات سنو، اپنے کام سے کام رکھو، مجھے اس حویلی کے کسی کمرے سے دلچسپی ہے نہ کسی کمرے والے سے۔"

"لیکن بی بی! یہ چھوٹے سائیں کا حکم ہے۔"

"وہ تمہارا سائیں ہے میرا نہیں۔ وہ یہاں مجھے زبردستی لایا ہے۔ میں نہیں مانتی اس کے کسی حکم کو بھی۔"

"ماننا تو پڑے گا تمہیں، چلو اٹھو، اندر چلو۔" وہ پیچھے سے آن نکلا تھا۔ ملازم اسے دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

"مجھے اندر ڈر لگتا ہے۔"

"روشنی ہے وہاں۔"

"مجھے یہیں بیٹھنا ہے۔" وہ ضدی ہوئی۔

"میں کہہ رہا ہوں اندر چلو۔" اور کہتے کے ساتھ ہی اس نے اسے کلائی سے پکڑ لیا اور کھینچ کر اسے آگے لے گیا۔

"تمہارے ساتھ ایک ملازمہ سوئے گی' تم اکیلی نہیں ہوگی۔" بتی جلا کے وہ اسے اندر چھوڑ آیا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پہ روتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

خانساماں کے بیمار ہونے کی وجہ سے بی جان نے اسے کچن میں لاکھڑا کیا "آج کھانا پینا سب تم کروگی۔"

"مجھے تو کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔" وہ رونے کے قریب تھی۔

"نوال تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں اسے بھیجتی ہوں اتنے میں تم کام شروع کرو۔" بی جان اسے وہیں چھوڑ کر خود باہر نکل گئیں۔ وہ اتنے بڑے کچن میں کھڑی آنکھیں پھاڑے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ گندے برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا دھونے کے لیے۔ جو یقیناً "اسے ہی دھونا تھا۔ اس نے بھری ہوئی آنکھوں سے اپنا جلا ہوا ہاتھ دیکھا اور بے ساختہ سسک پڑی تھی۔

"تم نے ابھی تک برتن نہیں دھوئے۔ بی جان کب سے تمہیں کہہ کر گئی ہیں۔" نوال نے اپنی مخصوص رپاٹ دار آواز میں کہا تو وہ اسے دیکھے بغیر برتنوں کی طرف بڑھ گئی۔

صابن لگاتے ہوئے اس کے ہاتھ میں شدت سے درد ہوا تھا۔ وہ کراہی بھی تھی لیکن وہاں اس کی سننے والا کون تھا۔ پھر جب نوال نے اسے پیاز کاٹنے کو دی۔ چھری پکڑنا اس سے محال ہو گیا تھا۔ نوال اسے سبزی کاٹنے پہ لگا کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اس سے۔ ابھی تک ۔۔۔ ایک پیاز بھی کاٹی نہیں گئی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں تیزی آتی چلی گئی۔ تب ہی پیچھے کھٹکا سا ہوا۔ اس کا خیال تھا نوال ہوگی اور اب آتے ہی جب اسے سستی سے کام کرتے دیکھے گی تو اسے پیٹ ڈالے گی۔

"نوال بھابھی! وکیل صاحب آئے ہیں' باہر آئیں پلیز۔" بازل نے اسے دیکھے بغیر کہا تھا۔ وہ فوراً" سیدھی ہوئی اور کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر ہاتھ میں پکڑی تیز دھار چھری بازل کے پیٹ میں گھسا دی۔ بازل نے سُرعت سے چھری آگے سے پکڑ لی تھی۔ بازل کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا تھا۔ سارے کچن میں خون پھیل گیا۔

"بازل خان' یہ تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟"

بی جان نے اپنے بیٹے کے ہاتھ پہ پٹی بندھی دیکھی تو تڑپ کر رہ گئیں۔

"کچھ نہیں۔ بس یوں ہی کچھ لگ گیا؟" اس نے انہیں ٹالنا چاہا۔

"خیر ہو مولا۔ کہیں کسی دشمن نے..."

"بی جان! ایسی کوئی بات نہیں' معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ زمر آپا نظر نہیں آرہیں۔" اس نے بات ہی بدل دی۔

"زمر اور نوال قبرستان گئی ہیں۔" تب ہی زمر' ماہ نور کو بالوں سے پکڑ کر اندر داخل ہوئی تھی دو جھٹکے دیے تو ماہ نور کی گھٹی گھٹی سی چیخیں نکلی تھیں۔

"ان لوگوں کی وجہ سے میں بیوہ ہوئی۔ میرے سر ۔۔۔ سے میرا سائیں اٹھ گیا میں لٹ گئی' برباد ہوگئی۔" اسے دو ہتھڑ مار کر دور گرایا تو وہ صوفے پہ ٹکے بازل کے زخمی ہاتھ پہ جا گری۔ بازل کے اندر تک درد کی شدید ٹیسیں پھیل گئیں۔

زمر آپا اسے مار مار کر پھر سے پچھواڑے والے کمرے میں ڈال گئی تھیں۔ وہ مفلوج جسم کے ساتھ روتی ہوئی بے بس پڑی رہی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب کوئی بھاری قدموں سے اس کے پاس آن رکا تھا۔

"تم نے دوا نہیں لی۔ یہ لو ابھی کھالو۔" اس نے شاپر پاس رکھا۔

"تھوکتی ہوں میں تمہاری دوا پہ۔" آواز پہچان کر وہ بھپر کو بولی۔

"ضد نہ کرو۔ دوا کھالو۔" اس کے لفظ لفظ سے غصہ پھوٹ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ابھی بچی ہو' تمہیں یہ زبان زیب نہیں دیتی۔ تم یہاں جس کام کے لیے رکھی گئی ہو بہتر ہے زندہ رہ کروہ

سب چپ چاپ کرتی جاؤ۔"

"تم لوگوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا' مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔" رندھی آواز میں تازہ زخموں کا درد تھا۔

"ابھی سے یہ حال ہے تو آگے جا کر کیا کرو گی؟" اس نے دانستہ اسے لٹ سے پکڑ کر کھینچا۔

"تمہیں قتل کر دوں گی۔" وہ دھاڑی اور اس پہ جھپٹ پڑی۔ بازل نے خود کو چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کی نجانے کیوں چپ چاپ اس سے مار کھاتا رہا' وہ اپنے تمام دکھوں اور زخموں کا بدلہ اس سے لینا چاہ رہی تھی اور بپھری ہوئی بھی ایسی ہی تھی۔ لیکن اسے مار مار کر وہ جلد ہی تھک کر ڈھے گئی اور ــــ رونے لگی۔

وہ ایک طرف بیٹھا چپ چاپ اسے روتا دیکھتا رہا۔

"اوہ' یہ کیا ہوا میرے بھائی کو۔ کس ظالم نے یہ وحشیانہ سلوک کیا۔" زمر آپا نے صبح اس کے چہرے پہ اتنی چوٹیں اور خراشیں دیکھیں تو چلا کر رہ گئیں۔ بی جان کا ہاتھ بھی سینے پہ پڑا تھا۔

"چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا لیکن بچت ہو گئی۔" اس نے دودھ کا گلاس پیتے ہوئے جھوٹ بولا تو اندر داخل ہوتی ماہ نور نے سر جھٹکا۔ بی جان نے فوراً سو' سو کے کئی نوٹ اس کے سر سے وار کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لے میرے بیٹے کا صدقہ ہے یہ۔" اس نے وہ سرخ نوٹ گھور کر دیکھے۔ اسے اپنی ہتک کا شدت سے احساس ہوا۔

"سوری' مجھ سے زیادہ ان کی ضرورت زمر آپا کو ہے کیونکہ میں صرف یتیم ہوں اور یہ بیوہ اور بے اولاد بھی ہیں' پلیز یہ انہیں دے دیں۔" اس کے الفاظ تھے یا آگ میں بجھے شعلے۔ ان تینوں نے جھٹکے سے اسے دیکھا تھا۔ پھر زمر آپا کو نہ جانے کیا ہوا تھا' روتے ہوئے ایک طرف بھاگ گئی تھیں۔ بی جان نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا اور ایک ساتھ کئی مکے اسے جڑ دیے۔

"تو نے میری بیٹی کو گالی دی کمینی عورت! میری بیٹی کی بے عزتی کی' میں تجھے زندہ قبر میں نہ ڈال دوں۔" بی جان نے طیش میں آ کر اسے نیچے گرا دیا تھا۔ بازل گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"بی جان' چھوڑ دیں اسے۔"

"نہیں' نہیں' چھوڑوں گی اسے' اس نے میری بیٹی کو رلایا ہے۔ اسے اس کے بے آسرا ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس نے اسے احساس دلایا ہے۔" بی جان اسے مار مار کر ہانپنے لگیں تو بازل نے اٹھ کر ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"بس کریں' یہ مر جائے گی۔"

"میں اسے مار دوں گی۔ جان سے مار دوں گی۔"

"ہاں تو مار دیں۔ میں کون سا جینا چاہتی ہوں' مجھے کل مارنا ہے تو آج ہی مار دیں۔" نیچے گری ــــ وہ چلا کر رہ گئی تھی۔

"آگے سے زبان چلاتی ہے بے غیرت۔" بی جان پھر سے اسے مارنے کو لپکیں مگر بازل نے قابو کر لیا۔

"ہاں تو رکی کیوں' مار دو مجھے' ابھی مارو' ابھی مارو۔" وہ پھر چلائی۔

"دیکھ' دیکھ' کیسی زبان چلا رہی ہے یہ۔ خونی کی اولاد ظالم قاتل کی بیٹی۔"

"اگر میں خونی کی بیٹی ہوں تو تم بھی مجھ سے کم نہیں۔ تم ایک خونی کی ماں ہو اور دوسرے خونی کی ساس۔ اگر میرے باپ نے تمہارے بیٹے اور داماد کو قتل کیا ہے تو تمہارے بیٹے اور داماد نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے اپنے بیٹے کا بدلہ لیا۔ حساب برابر کیا۔ اب زور تمہارا ہے نہ میرا' پھر کیوں مجھے باندی بنا رہی ہو' کیوں نیچا دکھا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی ایک بے بس' مجبور پہ ظلم کرتے۔ حیا نہیں آتی اپنے رویے پہ۔" وہ بولنے پہ آئی تو چلا چلا کر بولتی گئی۔

بی جان بپھر گئیں۔ "دیکھ کیسی بے غیرت لڑکی ہے یہ۔ کسی ذلیل خاندان کی پیداوار ہے یہ۔"

"ذلیل خاندان میرا نہیں تم لوگوں کا ہے۔ جو لڑکی میرے بھائی کے ساتھ گھر سے بھاگی جا رہی تھی' وہ اسی خاندان کی تھی نا۔ پھر اپنے خاندان کو کیا کہتی ہو؟" اس

نے بھنویں اچکا کر پوچھا تو بازل کا بھاری ہاتھ اس کے ہوش اُڑا گیا۔ اس کی وہ ساری رات بے چینی میں گزری تھی۔ ایک پل کے لیے بھی وہ سو نہیں سکا تھا۔ ساری رات سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا تھا۔ بار بار ایک ہی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔

"اگر میں خونی کی بیٹی ہوں۔ تو تم بھی مجھ سے کم نہیں۔ تم ایک خونی کی ماں ہو اور دوسرے خونی کی پیاس...." اس کمزور لڑکی کی پھنکار بار بار اندر گونج رہی تھی اور اس کی بے چینی —— بڑھتی جا رہی تھیں۔

"اگر میرے باپ نے تمہارے بیٹے اور داماد کو قتل کیا ہے تو تمہارے بیٹے اور داماد نے میرے بھائی کو قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے اپنے بیٹے کا بدلہ لیا۔ حساب برابر کیا۔" اس نو عمر لاابالی چھوٹی سی لڑکی کی زبان کیسے کھل گئی تھی۔ کیسے وہ چلا اٹھی تھی۔

جب کسی بے بس مجبور پہ تسلسل سے ظلم ہوتا رہے تو یقیناً "ایک دن ان کی زبانیں یوں ہی کھل جایا کرتی ہیں جیسے کہ آج ماہ نور کی کھلی تھی۔

"ذلیل خاندان میرا نہیں تم لوگوں کا ہے، جو لڑکی میرے بھائی کے ساتھ گھر سے بھاگی جا رہی تھی، وہ اسی خاندان کی تھی نا، پھر اپنے خاندان کو کیا کہتے ہو؟"

وہ جھٹکے سے کرسی سے اٹھا۔ اس کا تن بدن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کر دیکھا (جو اس نے ماہ نور کے چہرے پر مارا تھا) اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ وہ باقی ساری رات اپنے ہاتھ ہی کو دیکھتا رہا۔ بہت عرصے بعد یہ ہوا تھا کہ اس کی یہ رات صنوبر کی یادوں میں نہیں گزری تھی۔ آج اس نے کسی اور کو سوچا تھا اور ساری رات سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ اسے صحن میں کپڑے دھوتی دکھائی دی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے پاس آن رکا تھا۔

"آئندہ بی جان سے زبان درازی مت کرنا۔" اس

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء

تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کا شجرہ مفت حاصل کریں۔

قیمت -/300 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ -/50 روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہء عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کی بات پہ کپڑے رگڑتے اس کے ہاتھ رکے۔
"کیوں؟ ورنہ مجھے مار پڑے گی؟" اس نے غور سے اسے دیکھا۔
"اتنا تو معلوم ہے تمہیں۔"
"جانتی ہوں' کمزور لوگ ہاتھ چلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔"
"شٹ اپ۔" اس کا چہرہ سرخ ہوا' وہ ہنس پڑی۔
"سچ بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے۔" سر جھٹک کر اس نے ہاتھ میں آیا کپڑا جھٹکے سے زور لگا کر چیر دیا۔
"شاید یہ تمہاری قمیص ہے۔" گلے کے درمیان سے چری ہوئی قمیص اس نے اس کے سامنے کی۔
"اکثر میری طرح کے کمزور لوگ ایسا بھی کر دیتے ہیں۔" اس نے آنکھ سے دو ٹکڑے ہوئی قمیص کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"جتنی تم چھوٹی ہو نا' تمہاری سوچ اتنی چھوٹی نہیں۔"
"ہاں۔" اس نے سرہلایا۔ "لیکن اس سے بالکل الٹ۔ تم جتنے بڑے ہو نا' تمہاری سوچ اتنی بڑی نہیں بلکہ "بہت چھوٹی" سی سوچ کے مالک ہو۔" اس نے دو انگلیوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھ کر چھوٹی سوچ کا اشارہ کیا۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
"جانتے ہو بازل خان! تم نے مجھے بنا قصور کے یہاں لا کر کیا ثابت کیا ہے۔" وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔
"اپنے گھٹیا ہونے کا ثبوت دیا ہے تم نے۔" وہ لب بھینچے اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔
"تم نے ایک عورت پہ مردانگی چلانی چاہی۔ اپنے پیاروں کا مجھ عورت سے بدلہ لینا چاہا' افسوس صد افسوس۔ تم بہت کمزور مرد ہو بازل خان۔ بہت کمزور چچ چچ۔" اس نے افسوس سے سرہلایا۔
"جانتے ہو بازل خان' جو مرد عورت سے بدلہ لینے کا سوچتا ہے وہ مرد ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ صد افسوس تم اس کیٹیگری میں فٹ نہیں بیٹھتے۔" اس نے آرام سے کہہ کر اسے بہت کچھ جتا دیا۔ وہ اب بھی دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ وہ کپڑے لے کر اٹھتے ہوئے باقی بچا گندا سرف اس پہ ڈال گئی تھی۔
وہ بنا کچھ بولے اسے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔
زمینوں کے کاغذات یوں ہی پڑے تھے۔ عدالتوں میں کئی فیصلوں کی تاریخ آگے پیچھے ہو گئی تھے۔ منشی' پٹواری سب ہیرا پھیری پہ لگے اس کی راہ میں نظریں ٹکائے ہوئے تھے۔ لیکن اس کا دل تھا کہ ہر طرف سے اچاٹ ہو رہا تھا۔ اسے کسی کل چین نہیں مل پا رہا تھا۔ کھیتوں' کھلیانوں اور اپنی زمینوں میں جاتا تو دل اوب جاتا' ڈیرے پہ جا کے بیٹھتا تو اکتا جاتا۔ جرگوں میں اب اس نے جانا ہی چھوڑ دیا۔ باہر کی دنیا کے لیے دل خالی خالی سا رہنے لگا۔ رات کو نہ ڈائریاں کھولتا نہ صنوبر کے فوٹو دیکھتا۔ ساری ساری رات پچھواڑے کے بند دروازے کو دیکھتا رہتا۔ اندر لائٹ جلتی رہتی اس کا دل جلاتی رہتی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تصویریں تمہارے بابا نے مجھے آخری دنوں میں دی تھیں۔" وہ بی جان کے پاس آکر بیٹھا تو انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور ہاتھ میں پکڑی بہت سی تصویروں کا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ بی جان کے پیر دباتی ماہ نور نے سر جھکا تھا۔ بازل جو بی جان سے لفافہ لے رہا تھا کرنٹ کھا کر رہ گیا۔
"یہ کیا ہے؟"
"تیرے باپ نے کہا تھا۔ تم ان میں سے جس لڑکی پہ بھی ہاتھ رکھو گے وہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اسے تمہاری دلہن بنا دیں گے۔" بی جان کو اس کا انداز خاصا برا لگا تھا۔
"اور آپ جانتی ہیں میں نے بابا سائیں کو صاف منع کر دیا تھا۔" اس نے صاف لفظوں میں جتایا۔
"یہی تو قلق مجھے ساری زندگی مارتا رہے گا' تمہارے بابا سائیں تمہاری شادی کا خواب لے کر ہی

اس دنیا سے چلے گئے اور میں بھی۔۔۔"

"بس کردیں بی جان پلیز اور ان تصویروں کو آگ میں جھونک دیں' جو بات ناممکن ہے۔ بس ناممکن ہے۔"

"تم بہت ضدی ہو بازل خان۔" انہوں نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے اچانک پیر ماہ نور کو دے مارا تھا۔

"زور لگا بے غیرت۔ ہاتھوں میں دم نہیں ہے۔" انہوں نے ماہ نور کو مار کر اور گھرک کر کہا تھا۔ اب کی بار ماہ نور کے بجائے بازل کو واضح طور پر درد ہوا تھا۔

٭ ٭ ٭

اس دن جو ہوا عجیب ہی حادثہ تھا۔ وہ بڑے ہال کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ جب اچانک اس کا سانس بند ہونے لگا تھا۔ وہ کھانسنے لگی۔ سامنے صوفے پہ بیٹھی نوال بھابھی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کھانس کھانس کر دہری ہو رہی تھی۔ گرتے پڑتے وہ نوال کے سامنے پڑے پانی کے گلاس کو اٹھانے لگی تھی۔ جب نوال نے اس کے ہاتھ سے گلاس چھین لیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں باہر ابلنے لگیں تب ہی اسے گل دان کے پاس پڑا اپنا ان ہیلر نظر آگیا۔ وہ گرتی پڑتی اس تک پہنچی مگر اس سے پہلے ہی باہر سے آتی زمر آپا نے وہ اٹھا کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"یہ۔۔۔ یہ' مجھے۔۔۔ مجھے دے دو۔۔۔ مجھے مجھے۔"

"نہ۔۔۔ نہ۔ تمہیں ذرا تڑپتا تو دیکھیں۔ تمہاری تڑپ کا مزہ تو لیں۔" زمر کے ساتھ نوال کا قہقہہ بھی شامل ہوا تو وہ زمر کے پیروں میں گر گئی۔

"خدا۔۔۔ خدا کا۔۔۔ وا۔۔۔ واسطہ۔"

"ابھی نہیں۔ تھوڑا سا اور۔۔۔ تھوڑا۔۔۔ سا اور۔۔۔ تھوڑا اور۔۔۔ اور۔۔۔ شاباش۔" نوال اور زمر ہنستے ہوئے جیسے چٹخارے لے رہی تھیں اور انہیں پتا ہی نہ چلا کہ وہ تڑپ تڑپ کر بے بس ہو گئی تھی۔ اس کی باقی ماندہ ہمت جواب دے گئی تھی۔ اور باہر سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے بازل خان نے ایک نظر یہ منظر دیکھا تھا اور اس کی سانسیں وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

٭ ٭ ٭

گاڑی جانے پہچانے راستوں پہ رواں تھی لیکن وہ بیک سیٹ سے سر ٹکائے آنکھیں موندے کچھ بھی دیکھنے سے گریزاں تھی۔ وہ بھی چپ چاپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی اپنی مطلوبہ جگہ پہ جا کر جھٹکے سے رکی تو اس نے آہستہ سے بھینچی پلکیں اٹھالیں۔ آنکھیں لال سرخ تھیں' اور آنکھوں سے ذرا سا پانی چھلک کر گالوں کو چھو گیا تھا۔ بازل نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔

"تمہارا گھر آگیا۔"

"میرے بابا۔" وہ اپنے باپ کا گھر دیکھ کر بے اختیار سسک پڑی۔

"آجاؤ۔" اس کی طرف کا دروازہ کھول کر وہ نرمی سے بولا تو وہ سسکتی ہوئی باہر نکل آئی۔

وہ گھر جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ بھائی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔ بابا کی گود میں پلتی آئی تھی۔ وہی دروازہ۔ وہی راہ داری' وہی ہال' سامنے بابا کا کمرہ ایک طرف بھائی کا۔۔۔ اور دوسری طرف اس کا اپنا۔۔۔ مگر وہ اپنے کمرے میں سوئی کب تھی۔ اکیلے میں تو اسے ڈر لگتا تھا۔ شروع سے باپ بھائی کے کمرے میں رہتی آئی تھی اور اگر وہ نہ ہوتے تو کل وقتی ملازمہ اس کے ساتھ پائی جاتی۔ اس نے اکیلے رہنا سیکھا تھا' نہ اکیلے سونا۔ وہ بابا کے کمرے میں بیٹھ کر دیر تک روتی رہی تھی اور وہ چپ چاپ اسے روتا دیکھتا رہا تھا لیکن جب رہا نہ گیا تو اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"بس کرو' تمہاری پہلے ہی صحت ٹھیک نہیں۔" اور وہ چاہتے ہوئے بھی آنسو روک نہیں پا رہی تھی تب ہی مجبوراً وہ سامنے کھڑا ہو کر اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا اور ایسے میں وہ خود پہ قابو نہ رکھ سکی تو اس کے شانے سے

جا لگی۔

"مجھے واپس جانا ہے۔" وہ دل کڑا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔" سہما لہجہ اس کے اندر کی حالت کا غماز تھا۔

"مجھے جانا تو ہے۔" وہ کچھ نہ بولی تو وہ دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"تم آج رک نہیں سکتے۔" اس کی آواز نے اس کے قدم دروازے میں ہی جکڑے۔ وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"رات ہے نا' مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔" وہ مسکینی سے بولی۔ ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگی۔

"میرے ہوتے ہوئے کیا تم نہیں ڈرو گی؟" وہ دو قدم اس کے قریب آگیا۔

"پلیز رک جاؤ نا۔"

"پتا ہے نا' میں مارتا بھی ہوں۔"

"پلیز۔" وہ لجاجت سے بولی۔ "اندھیرے سے مجھے ڈر لگتا ہے' اور اکیلے میں میری جان نکل جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"تم رکو گے نا؟" اس نے آس سے پوچھا۔ وہ کچھ دیر بغور اسے دیکھتا رہا۔ پھر سر ہلا دیا۔

اور وہ اس رات بہت سکون سے سوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم سوئے نہیں۔" صبح وہ اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر بے اختیار بولی تھی۔

"کہاں سونا؟"

"ارے' یہ پورا گھر ہے۔ اتنا بڑا ہے۔ جس طرف چاہتے سو جاتے۔" بازل بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔

"بہت معصوم ہو تم یا شاید پاگل۔"

"کیا مطلب؟" وہ الجھی۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے۔"

"چھوڑو سب مطلب وطلب۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ ایک اسٹرونگ سا کپ مل جائے گا؟"

"ارے تم بھی اسٹرونگ چائے پیتے ہو؟" وہ بے اختیار چیخی۔

"مجھے بھی زیادہ پتی والی چائے اچھی لگتی ہے۔"

"تم پھر دو کپ بنالو۔" وہ ذرا سا مسکرا کر نرمی سے بولا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجا۔ اسکرین پہ گھر کا نمبر تھا۔

"جی السلام علیکم! بی جان میں یہیں ہوں۔۔۔ جی وہ بچ گئی ہے۔" اس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ماہ نور اسے بات کرتا دیکھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی لیکن بازل کے اگلے الفاظ نے اس کے قدم روک دیے تھے۔

"بی جان! یہ معصوم ہے' بچی ہے۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو اسے اٹھا کر آپ لوگوں کے پاس لے گیا۔ زمر آپا اور نوال بھابھی نے اس پہ طرح طرح کا ظلم کیا۔ اسے مارنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ بہت افسوس کی بات ہے۔ یقین مانیں' مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا ہے۔" وہ اپنی ماں سے اس کے حق میں بات کر رہا تھا۔ اس بات نے بے اختیار اس کا نرم و نازک دل گدگدایا۔ چائے بنا کر وہ واپس آئی تو وہ بات ختم کر چکا تھا۔

"سنو!"

"جی؟"

"تم اپنے بھائی کا خون ہمیں معاف کر سکتی ہو؟" تمہید کے اس نے پوچھا۔

"تو کیا تم اپنے پیاروں کا خون معاف کر سکتے ہو؟" اس نے بھی جواباً پوچھا۔

"سمجھداری کا یہی تقاضا ہے کہ اب ہمیں کوئی نہ کوئی گنجائش نکال لینی چاہیے۔ یہ خاندان' برادری کے مسئلے ختم کرنے چاہئیں۔ پہلے جو ہوا اور جو

رسموں' رواجوں کی وجہ سے ہوا' اب ہمیں ان رسموں' رواجوں کو توڑنا چاہیے اور دوبارہ سے وہی اصول اپنانے چاہئیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے ہمارے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہمیں دیے تھے۔ انہوں نے حسب نسب کو مٹا کر ہر انسان کو برابری' مساوات اور عدل کا درس دیا۔"

"قربان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"اسلام میں قتل کا بدلہ صرف قتل نہیں۔۔۔ بلکہ اس میں صلہ رحمی اور درگزر و معافی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔"

"تو اتنا علم رکھتے ہو۔ پھر بھی۔۔۔" بے اختیار شکوہ کر گئی۔

"بس سنبھلنے کا بھی کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے اور یہی سمجھ لو کہ اس علم نے اب جا کے مجھ پہ اثر کیا ہے اور میں اب سنبھلا ہوں ورنہ اس سے پہلے میں بھی ان رسموں' رواجوں میں الجھا ہوا تھا۔" اس نے ایمان داری سے اپنا تجزیہ کیا تھا۔ وہ سر ہلانے لگی۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ اس بات پہ تم مبارک باد کے مستحق ہو۔"

"شکریہ۔۔۔ اور اس کے لیے میں تمہارا زیادہ شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے یہ احساس ہوا اور مجھے سب جاننے کا موقع ملا۔" اس نے فراخ دلی سے کہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"تم آج بھی نہیں رک سکتے۔" وہ اگلے دن پھر اس کے پیچھے کھڑی اسے روک رہی تھی۔

"مجھے جانا تو ہے' آج نہیں تو کل۔۔۔ لازمی جانا پڑے گا۔" اس کا لہجہ بجھا ہوا سا تھا۔

"آج رک جاؤ۔ کل چلے جانا۔"

"اور اگر کل پھر تمہیں ڈر لگا تو۔۔۔؟" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تو پھر رک جانا۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ مدھم سا مسکرا دیا۔

"روز روز رکنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" وہ دل پہ پتھر رکھ کے بولا۔

"تو پھر میں اکیلی کیسے رہوں گی؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل سوچنا پڑے گا۔"

"ہاں۔۔۔ کوئی حل نکالو نا پلیز۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ کہیں بھاگ ہی نہ جائے۔ بازل نے گہری نظروں سے اپنے ہاتھ پہ اس کا ہاتھ دیکھا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے' ان ہاتھوں کو ہمیشہ کے لیے ایک نہ کرلیں؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"بازل خان ولد زیان خان' ماہ نور شہباز ولد شہباز محمود کو زوجیت میں لینے کا فیصلہ کر چکا ہے تو کیا یہ فیصلہ آپ کو قبول ہے؟" اور ماہ نور نے جو بے ساختہ حیران نظریں اٹھا کر اسے دیکھنا چاہا' اس کی چمکتی آنکھوں نے اسے وہیں پلکیں گرا لینے پہ مجبور کر دیا۔

"بولو کیا قبول ہے؟" وہ پھر بولا۔ ماہ نور کے ہاتھوں سے پسینہ چھوٹ پڑا۔

"میں نے پوچھا قبول ہے؟" بھاری آواز میں گرج تھی دھمک تھی' جو اگلے کا دل دہلا دینے کو کافی تھی لیکن اگلے کا دل دہلا نہیں تھا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے گلے میں لٹکے تعویذ کو پکڑ لیا تھا۔

"جب خودکشی ہی کرنی ہے تو ٹھیک ہے' دونوں ایک ساتھ کرتے ہیں۔" اور بازل خان کا زوردار قہقہہ بلند ہو گیا تھا۔